Ketabton.com

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں ملزم نہیں، مدعی ہوں

عالم زیب محسود

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہے

کتاب:	میں ملزم نہیں، مدعی ہوں
مصنف:	عالم زیب محسود
کمپوز:	ابو زمرک افغان
اشاعت:	اکتوبر2020
تعداد:	ایک ہزار
قیمت:	250
ناشر:	کتاب کور پرنٹنگ پریس پشاور

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

فہرست مضامین

1. شروع	4
2. میں ملزم نہیں مدعی ہوں	6
3. زندان میں ایک چھوٹا سا پاکستان	12
4. میں کیسے مان لو	18
5. لاپتہ افراد کے طرف میرا رجوع	23
6. لافتہ افرا کا معاملہ کب اور کیسے	31
7. میری گرفتاری	39
8. ملیر کینٹ میں میرے پانچ دن	48
9. لاپتہ افراد کے ساتھ انٹر ٹمنٹ	55
10. لینڈ مائنز کے خلاف ہم نے کیا	62
11. عام عوام پر تشدد	69
12. عام عوام پر تشدد (دوسرا قسط)	77
13. چیک پوسٹ اور تضحیک	84
14. پاک فوج کے کندھوں پر بوج	89
15. نقیب اللہ شہید کے والد سے میرا گلہ	94
16. زبندگی اور موت	97
17. ریاست کے لئے اگلا رستہ	103
18. سنٹرل جیل کراچی میں میرا اخری تحریر	105

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان
اور نہایت رحم والا ہے

میں ملزم نہیں، مدعی ہوں میری پہلی تصنیف ہیں جو کے میں نے جیل میں پابند سلاسل ہونے کے دوران لکھی۔ اگرچہ میں بہت زیادہ لکھ سکتا تھا لیکن اسکی مجھے اجازت نہ تھی اور جو کچھ میں نے لکھا وہ میں لکھ لینے کے بعد باہر دوستوں کو بھیج دیا کرتا تھا۔ 21 نومبر 2019 کو مجھے کراچی میں گرفتار کیا گیا تھا اور پھر 8 ماہ میں نے کراچی سینٹرل جیل کے کال کھوٹریوں میں گزارے۔ ایک سیاسی زندگی شروع کرنے کے ساتھ مجھے یہ کبھی اندازہ نہ تھا کہ مجھے ایسے حالات پر سے بھی گزرنا ہوگا، شاہد اسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے سیاست کم عمری، کم علمی میں ایک ایسے جماعت سے شروع کی جس کا پلڑا اِس ملک کے ملٹری اسٹیبلشمنٹ کی طرف خاصا جُھکا تھا۔ ایک حقیقی سیاست اور اپنے قوم کی حقیقی خدمت میں قدُم رکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ سیاست پھولوں کی سیٹج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔ اگرچہ اسطرح کے مشکلات نے ایمان ویقین کے درجات بلند کئے مگر یہ سب آسان کبھی نہ تھا۔ یہ کتاب ہماری جدوجہد سے متعلق ایک تعارف سمجھ لیں کہ ہم نے جو مطالبات اس تحریک (پی ٹی ایم) کے شروع ہونے پر کئے اسکے پیچھے کیا محرکات تھے۔ کیونکے میں نے یہ کتاب جیل میں لکھی اور چونکہ مجھے جیل میں صرف اپنے قوم کے لئے آواز اٹھانے پر ڈالا گیا تھا اسلیے اس کتاب میں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔اسکو لکھنے سے متعلق میرا مقصد خالصتاً یہ تھا تاکہ تاریخ کو کل کوئی مسخ نہ کر سکے کیونکے جو قوم اپنی تاریخ خود نہیں لکھتی، اسکی تاریخ اغیار مسخ کر دیتے ہیں۔اس سے میری قوم اور اسکی آنے والی نسلیں اور باقی دنیا جانیں گی کہ اس ملک کے ناخداؤں نے اس قوم پر کیا ظلم کئے تھے، کیسے انسانی حقوق کی پامالی کی جارہی تھی، کیسے آئین وانسانیت سے ہٹ کر زندان بنائے گئے تھے اور اُن تاریک زندانوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور اسکے خلاف آواز اٹھانے والے انسانوں کے ساتھ کیا ہوا تھا، کل ملا کر یہ اس ریاست کے خلاف ایک چارج شیٹ ہے

جس طرح قید و بند کی صعوبتیں گزارنا ہمارے اوپر اس عظیم قوم کا ایک قرض تھا اسطرح اسکے حالات ایمان داری سے لکھنا بھی ایک قرض تھا جسکو چھکانے کی اپنی حد تک کوشش کی ہے۔

عالمزیب خان محسود

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں ملزم نہیں، مدعی ہوں

جیل کے بند وارڈ میں کوئی سات ماہ گزار چکا تھا اور یہ بند وارڈ 10 کال کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا، جہاں سے صرف دو صورتوں میں مجھے باہر نکالا جاتا، پہلی صورت یہ کہ ملاقات کے لئے کوئی آئے جو میری ہفتے میں دو بار 20 منٹوں کے لئے ملاقات ہوتی اور اس صورت میں پی ٹی ایم کے ساتھی اور میرے رشتہ دار ملاقات کے لئے آتے تھے اور دوسری صورت یہ تھی کہ جب مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا۔ عدالت میں میرے لئے میرے تعلیم یافتہ ہونے کی بنیاد پر (بی) کلاس سٹیٹس یعنی جیل میں اچھی کلاس دینے کی درخواست دی گئی تھی، اور اس درخواست کو میری ڈگری کی متعلقہ یونیورسٹی سے تصدیق کی بنیاد پر قبول ہونا تھا، چنانچہ یونیورسٹی سے چار بار تصدیق ہوئی مگر کوئی نہ کوئی خامی نکال کر پھر سے ڈگری بھیجیں جاتی۔ اسطرح اللہ اللہ کر کے 5 ماہ بعد مجھے (بی (کلاس سٹیٹس ملا جس کے بعد قانونی طور پر مجھے (بی) کلاس کے بیرک میں بھیجا جانا تھا، مجھے وہاں پڑھنے اور لکھنے کی سہولت ہوتی، اور کچھ گھنٹوں کے لئے باہر نکالا جاتا، ٹی وی اور اخبار کی سہولت موجود ہوتی۔ مگر آفیشل بی کلاس ہو کر بھی مجھے بی کلاس نہیں بھیجا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ جیل انتظامیہ ایسا کیوں کر رہی ہے تو میں نے ایک پیشی کے دوران جج صاحبہ کو کہا کہ آپ کی ھدایات کے باوجود مجھے بی کلاس نہ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی بہت بڑا ملزم ہوں بلکے اسکی وجہ یہ ہے کہ میں مدعی ہوں اور میں نے اس ملک کے ہر اس ادارے پر دعویٰ کیا ہے جس نے میری قوم کا بے دریغ قتل عام کیا ہے تو جج صاحبہ سیخ پا ہو گئی کہ تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو۔ میں نے کہا کہ جیل میں ملزم کو اپنے وارڈ سے نکلنے کی اجازت ہوتی ہے، وہ ظہر اور عصر کی نماز باجماعت پڑھ سکتا ہے، اس کے پاس ٹی وی بھی ہوتا ہے اور اخبارات بھی لے سکتا ہے، وہ وہاں کسی اسکول یا فائن آرٹس میں داخلہ بھی لے سکتا ہے، وہ دوسرے قیدیوں سے بات چیت بھی کر سکتا ہے اور جناب ان قیدیوں میں ایسے ایسے قیدی بھی ہیں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

جن پر سنکڑوں لوگوں کی ٹارگٹ کلنگ کا الزام ہے یا الزام ثابت بھی ہو چکا ہے، ان میں وہ بھی ہیں جن پر بلدیہ فیکٹری میں آگ لگا کر سنکڑوں عورتوں اور بچوں کو لقمہ اجل بنانے کا الزام ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انکو یہ سہولیات نہ دی جائیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جیل میں ہونے والی کرپشن اور ظلم کا بھی خاتمہ کیا جائے تاکہ قیدیوں کو سدھرنے کا موقع ملے، مگر سوال یہ ہے کہ میں نے ایسا کون سا بڑا گناہ کر دیا ہے کہ پوری جیل میں صرف میں ہی بند وارڈ میں ہوں۔ جج صاحبہ نے کہا کہ تم لوگوں کو لیکچر دیتے ہو جس طرح جیل انتظامیہ نے عذر پیش کیا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست اسی لئے نہیں ہے کیونکہ میں پہلی آمد میں ہی بند وارڈ میں ہوں تو کیا میں دیواروں کو لیکچر دے رہا تھا۔ اور اگر یہ بات مان بھی لی جائے یا اس عزر کو مان لیا جائے کہ میں نارمل جیل میں جا کر لوگوں کو لیکچر ز دونگا تو آپ بھی تو یہ دیکھیں کہ میں کونسا ان کو کفر کی طرف بلاؤں گا۔ جج نے میری بات کاٹتے ہوئے بولا کہ باہر بھی تم نے لوگوں کو اکسایا ہے اور اداروں کے خلاف نفرت پھیلائی ہے۔ میں نے کہا کہ نہ میرے کہنے سے تو اداروں سے محبت بڑھائی جاسکتی ہے اور نہ ہی نفرت۔ محبت اور نفرت اعمال کی بنیاد پر ہوتے ہیں میں نے جو باتیں کیں وہ آپ کے سامنے ہے، کیا لاپتہ افراد کی بات کرنا غلط ہے جس پر اہپکس کورٹ بھی دو دفعہ فیصلے دے چکا ہے جس پر کوئی عمل نہیں ہو رہا۔ کیا ہمارا آئین اور بین الاقوامی قوانین اسکے متعلق بڑی واضح نہیں ہیں؟

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ کے آرٹیکل 5 کے مطابق کسی کو بھی ظالمانہ، غیر انسانی اور ذلت آمیز سزا یا تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ آرٹیکل 9 کے مطابق، کسی کو بھی ماوارئے عدالت گرفتاری یا نظر بندی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ آرٹیکل دس کے مطابق، ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ اس کے خلاف کسی بھی مجرمانہ الزام کے بارے میں آزاد اور غیر جانبدار ٹریبونل کے ذریعہ عوامی سماعت ہو۔

اور میں اگر پاکستان کے آئین کی بات کروں تو کیا آرٹیکل 4 واضح نہیں کہتا کہ ہر شخص کو چاہے وہ اس ملک کا شہری ہو یا اس وقت اس ملک میں رہ رہا ہو، اسے قانون کا تحفظ حاصل ہو گا اور صرف

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

قانون کے تحت ہی اس کو ڈیل کیا جائے گا۔ آرٹیکل 9 کہتا ہے کہ کسی کو اس کی جان اور آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا سوائے قانون کے مطابق کوئی جرم ثابت ہونے پر۔ آرٹیکل 10 کہتا ہے کہ کسی بندے کو گرفتار کرنے کے بعد کسٹڈی میں نہیں رکھا جائے گا جب تک عدالت کے سامنے چوبیس گھنٹے کے اندر پیش کر کے باقاعدہ کسٹڈی میں رکھنے کی اجازت نہ لی جائے اور یہ کہ اسکو دفاع اور مشاورت کے لیے وکیل کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ کیا لاپتہ کر دینا بنیادی انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی نہیں؟ جج صاحبہ نے کہا کہ سارے لاپتہ افراد اداروں پر کیوں ڈال رہے ہو، انہوں نے اس الزام کو رد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے جواب کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ

اگر اس حوالے سے آرمی کا یہ مؤقف تسلیم کیا جائے کہ ہر لاپتہ فرد کو ریاست پر نہیں ڈالا جا سکتا تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ لاپتہ افراد کے خاندان والے جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے پڑوسی یا نزدیک دکاندار بھی جھوٹ بولتے ہیں جو اس بات کے گواہ ہیں کہ ان لاپتہ افراد کو باوردی لوگوں نے ان کے آنکھوں کے سامنے اٹھایا ہے۔ اور کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس ملک میں کوئی آرمی پر جھوٹ یا تہمت باندھے گا؟ نہیں جناب کبھی نہیں، لاپتہ افراد کے خاندان والے اتنے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ اکثریت اپنے لاپتہ افراد کی بات کرتے ہی نہیں ہیں کیونکہ ہم نے ایسے بھی کیس دیکھے ہیں کہ باپ اپنے لاپتہ بیٹے کے لئے انٹیلی جنس اداروں کے در پر دستک دیتا رہا تو اسے بھی غائب کر دیا گیا اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ آرمی اسطرح خود کو بری الزمہ کر کے کس کو بیوقوف بنانا چاہتی ہے۔ میں نے کہا آپ سن لیں اس مسئلے کے سب سے بڑے شکار پشتون اور بلوچ ہیں اور آپ اسطرح سے ان کو بیوقوف نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اپنے اوپر لگے اس داغ کو دھو سکتے ہیں۔ جواب کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ لاپتہ افراد کے لیے بنائے گئے کمیشن کے ذریعے بھی بہت سارے لوگ بازیاب ہوئے اور ان کی فیملیز کی ملاقات اپنے پیاروں سے آرمی کے انٹرنمنٹ سیلز میں ہوئی ہے۔ کئی لوگ رہا بھی ہوئے تو کیا جیسا کہ آرمی کہتی ہے کہ یہ لوگ طالبان کے ساتھ ہیں، یا جہاد پر

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

گئے ہونگے تو کیا طالبان ان لاپتہ افراد کو کمیشن کی درخواست پر پاک آرمی کے انٹرمنٹ سنٹرز میں چھوڑ رہے ہیں یا رہا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ 2018 میں بہت سارے لاپتہ افراد کو ملٹری کورٹ نے سزائے موت کی سزا سنائی تھی جب ان کی فیملیز پشاور ہائی کورٹ میں گئیں تو پشاور ہائی کورٹ نے ملٹری کورٹ کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے دیا اور ہائی کورٹ کے بہت سارے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جن لوگوں کو ملٹری کورٹ نے سزائے موت دی ہے وہ تو کوئی 2009 میں لاپتہ ہے تو کوئی 2010 میں لاپتہ ہے جن کی رٹ پٹیشنز بھی عدالتوں میں لگی ہیں تو 2015 میں قائم ملٹری کورٹ 2009 میں لاپتہ افراد فرد کو سزا نہیں دے سکتا اور یہ کہ تقریباً سب کو اپنا جرم تسلیم کرنے پر سزا دی گئی ہے، یعنی کوئی ثبوت نہیں دیا گیا، صرف آئی ایس پی آر نے یہ کہا ہے کہ انہوں نے اقبال جرم کیا ہے۔

میں نے کہا کہ 2009 سے لاپتہ بندہ اقبال جرم نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا جہاں ان کو بدترین سزائیں دی جاتیں ہیں۔ وہ تو بڑی خوشی سے اقبال جرم کریں گے تا کہ اس ذلت کی زندگی سے جلد از جلد چھٹکارا ان کو ملے اور یہ بھی ہمارے آئین کی خلاف ورزی ہے۔ آرٹیکل 14 کہتا ہے کہ کسی بھی شہری کی عزت، چادر اور چار دیواری کو پامال نہیں کیا جائے گا اور کسی بھی شخص کو ثبوت نکالنے کے مقصد سے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہاں تو تشدد سے ثبوت اس وقت نکالتے اگر کوئی ثبوت ہوتے، یہاں تو صرف اقبال جرم کروایا گیا اور یہی کام میرے ساتھ بھی ہوا ہے لیکن جیسے ایک شاعر نے کہا ہے کہ

کچھ اہل ستم کچھ اہل حشم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کر چھوڑ دیا دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے

جج صاحبہ نے کہا کہ میری اس سے متعلق معلومات کمزور ہیں، میں نے کہا کہ اگر معلومات کمزور ہیں تو میری تقریر پر فیصلہ کیسا ہوگا جسمیں میں نے یہی باتیں توکی ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ میڈم ہم نے بہت کچھ دیکھا اور سہا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کی کٹی ہوئی لاشیں اٹھائی ہیں، میرا یہ کہنا ہی تھا کہ

Scanned with CamScanner

جج صاحبہ نے کہا کہ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہماری آرمی نے لینڈ مائنز لگائے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب مجھے تفصیل سے دینے دیں مگر مجھے سننے کے لئے تیار نہ تھی میں صرف اتنا کہہ سکا کہ چلو شکر ہے آپ یہ تو مانتی ہیں کہ بچے لینڈ مائنز کا شکار ہو رہے ہیں ورنہ یہاں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لاپتہ افراد ہمارے پاس نہیں بلکہ ہمارے خلاف لڑ کر مارے گئے ہوں گے وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ لینڈ مائنز کے شکار لوگ لینڈ مائنز لگاتے ہوئے خود اس کا شکار ہوئے ہیں۔ میری جن ویڈیوز کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا کہ جس پر آپ نے میری ضمانتنت ریجکٹ کی تھی، کیا وہ چار چار پانچ پانچ سال کے بچے لینڈ مائنز لگا سکتے ہیں، ہاں مگر لگا سکتے ہیں کیونکہ ریاست نے پشتونوں کی ایسی پروفائلنگ کی ہیں کہ شاہد باقی ملک ان کی اس لغو بات کو بھی حقیقت مان لے، اس پر پورے کورٹ روم میں خاموشی چھا گئی۔

شاہد اس پر بھی ان کی معلومات اتنی ہی کمزور تھیں۔ میں نے کہا کہ جس نعرے کو لے کر مجھ پر سب سے زیادہ اعتراض ہو رہا ہے یعنی "یہ جو دہشت گردی ہے اس کے پیچھے وردی ہے" اگر یہ قابل مواخذہ ہے تو یہی نعرہ آج سے کچھ دن پہلے سپریم کورٹ کے اندر لگا ہے جب جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کا کیس سنا جا رہا تھا اور اس نعرے کا پورا ایک بیکراونڈ ہے اور پشتونوں کے پاس خاص کر اس کو ثابت کرنے کے لئے دلیلوں اور ثبوتوں کی کمی نہیں ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس پر صرف پشتونوں کے خلاف ہی کروائی کیوں ہو رہی ہے؟ آج اس ملک میں ہر ادارے بشمول عدلیہ میں مداخلت کے پیچھے وردی نظر آتی ہے، اور آپ نے مجھے زندان بلکہ زندان کے اندر ایک اور زندان میں ڈالا ہوا ہے مگر بلآخر جو بات میں کر رہا ہوں وہ ایک دن آپ اور استغاثہ دونوں کو تسلیم کرنی ہوگی۔ اگر آپ نہیں تو آپ کی نئی نسل یہی بات کرے گی کیونکہ اس ملک کا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔

اگر آرمی کو ہر فیصلے کے کرنے کا اختیار حاصل ہے، تو میں نہ صرف اپنے الفاظ واپس لونگا بلکہ معافی مانگوں گا لیکن اگر بات آئین اور عدالت کی ہے تو اس کے حدود بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ جج صاحبہ نے اس کے بعد مجھے ایک لمبی تاریخ دے دی یعنی ڈیڑھ مہینے کی تاریخ دے دی۔ میں جب

(c) ketabton.com: The Digital Library

کورٹ سے نکل رہا تھا تو خود کو کھوس رہا تھا کہ میں اپنے لیے سہولیات کیوں مانگ رہا ہوں اگرچہ بی کلاس ہونے کے ناطے میرا حق ہے لیکن اگر جس حقوق کی بات کر کے مجھے جیل میں ڈالا گیا ہے اگر وہی بنیادی حقوق میرے جیل کے اندر پامال ہیں تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ میں ملزم تھوڑی ہوں اگر ہوتا تو باقی ملزموں کے ساتھ ہوتا مجھے اتنے مہینوں سے سب سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے کیونکہ میں ملزم نہیں ہوں، بلکہ مدعی ہوں اور میرا ان تمام پر دعویٰ ہے جنہوں نے پشتونوں کی بربادی میں اپنا حصہ ڈالا ہے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

زندان میں ایک چھوٹا سا پاکستان

کراچی سینٹرل جیل کے بند وارڈ سیکورٹی 8 کا قیدی، ویسے تو یہاں جیل کے ان کے قیدیوں کو ڈالا جاتا ہے جو جیل کے اندر کوئی سنگین مجرمانہ فعل کرے تو سزا کے طور پر انہیں چند روز یہاں رکھا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی کال کوٹھڑیاں بنائی گئیں ہیں جن میں قیدی کو بند کیا جاتا ہے۔ اس کو کھانے پینے کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہیں ہوتی، یوں سمجھ لیں کہ یہ جیل کا ایک چھوٹا سا پاکستان ہے جہاں آزادیاں سلب کی جاتی ہیں۔ مجھے جیل میں لاتے ہی یہاں ڈال دیا گیا، یقیناً میں جرم بھی تو بہت بڑا لے کر آیا تھا۔ یہاں اپنی قوم کیلئے امن کی بات کرنا، ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور ریاستی اداروں کا ان کو ڈالرز کمانے کا ذریعہ بنانا، ملک کے اندر اور باہر اسے شیطان کے روپ میں پیش کرنا۔ ان کے خلاف اگر بات کروگے تو یہ سب سے بڑا جرم ہے، اتنا بڑا جرم کہ قتل وغارتگردی، فتنہ وفساد اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جیل میں وہ قیدی بھی ہیں جن کے خلاف بلدیہ فیکٹری میں آگ لگانے کا کیس چل رہا ہے جن میں تین سو سے زائد معصوم جانیں زندہ جل کر راکھ ہو گئی تھی جن میں اکثریت خواتین اور بچوں کی تھیں، یہاں ایسے بھی قیدی ہیں جو بچوں کے ساتھ زنا بالجبر کر کے آئے ہیں لیکن ان کو اخبار تک کی رسائی بھی ہے ٹی وی بھی دیکھتے ہیں انہیں باہر گھومنے کی بھی آزادی ہوتی ہے ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے کی آزادی ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ مجھے میسر نہیں کیونکہ میرا جرم ان سے بہت بڑا ہے۔ جہاں ریاستی اداروں نے ریاست کو منڈی بنا کر رکھا ہو کہ جہاں سب کچھ برائے فروخت ہو جہاں اسلام میں ڈالر نظر آئے تو سارے ملک میں مذہبی جنونیت پھیلا دی جائے جب اس کی مخالفت میں ڈالر نظر آئے تو ماننا پڑے کہ جو پہلے جہاد تھا، وہ اب فساد ہے۔ روشن خیالی بھی متعارف کروائی گئی تو ایسے کہ جہاں اظہار رائے پر مکمل پابندی ہاں مگر سیاسی جماعتوں اور جمہوریت کے خلاف جتنا بھی غلیظ سے غلیظ زبان استعمال کر سکتے ہو تو آزادی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ سے صرف ڈالر بٹورنے کی کوشش ہوئی، پختونخواہ کا اس جنگ میں بے تحاشہ نقصان ہوا مگر ہم نے دیکھا کہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پختونخوا کو صرف ایک ٹریننگ کیمپ بنائے رکھا گیا جہاں دہشت گرد مینوفیکچر ہوتے تھے۔ ہر اس آواز کو قتل کیا گیا جس نے اس جھوٹے کھیل کو روکنا چاہا یا جس سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ آواز ان میں اہل شعور کی ہے جو اس تماشے کو سمجھتے ہیں اور اس کی کوشش آج بھی ہو رہی ہے، میں بھی اس کوشش کا نتیجہ ہو۔ آج میں بقول حضرت یوسف علیہ السلام زندوں کے قبرستان میں تکلیف میں ضرور ہوں مگر دل بہت مطمئن ہے اور اللہ کا شکرادا کرتا ہوں کہ میں کسی کا حق مار کر یہاں نہیں آیا بلکہ مخلوق خدا کا حق مانگنے کی پاداش میں یہاں ہوں، میں کسی پر ظلم کر کے یہاں نہیں پہنچا بلکہ مظلوموں کی آواز اٹھانے پر یہاں ہوں۔

یہ سوچ مجھے بہت ہمت دیتی ہے ورنہ اس چھوٹی سی کھال کھوٹری کی دیواریں اور سلاخیں مایوسی کا گھر ہیں یہاں کام کرنے والے قیدی مجھے بتاتے ہیں کہ یہاں کئی قیدیوں نے اپنے گلے کاٹ کر خودکشی بھی کی ہیں۔ اس کی دیواروں پر کنندہ تحریریں بھی اس کا ثبوت ہیں۔ تحریروں سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے مار کر سے کی ہیں مگر یہاں بند وارڈ میں جہاں آپ کے پینٹ کا بیلٹ اور شلوار کا ناڑا تک لے لیتے ہیں وہاں مار کر کیسے آیا، بغور مشاہدہ سے اندازہ ہوا کہ وہ خون سے لکھے گئے تحریریں ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے اپنے نام اور جرم لکھے ہیں میرے سامنے ایک جگہ خون سے لکھا ہے کہ عمران علی 302، مدثر حسن 302 اور اس طرح ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ وقت بھی گزر جائے گا" اور یہ کہ "مجبور سہی وقت سے ہارا تو نہیں ہوں"۔ جیل انسان کو کافی کچھ سکھا دیتا ہے یہاں پر انسان باہر دنیا سے بالکل کٹ جاتا ہے اور اسے سوچنے کے لئے بہت سارا وقت مل جاتا ہے۔ سوچنے کا یہ انداز میرا وزیرستان میں ہوتا تھا وہاں بھی انسان باقی دنیا سے بالکل کٹ جاتا ہے۔ جبکے بند وارڈ کا مطلب تو گویا مزید جیل کی دنیا سے کٹ جانا جیسے پاکستان میں قبائلی علاقے۔ مجھنے بند وارڈ میں رکھنے کے پیچھے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں کسی سے بات نہ کر سکوں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو تھانے میں وہ پانچ روز ایسے گزارے تھے آنکھوں پر پٹی تھی اور حوالات کے اندر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ تھانے والے کہتے تھے ہم مجبور ہیں پیچھے سے آرڈر ہیں۔ ان کو ہدایت تھی کہ میں کسی کو نہ دیکھ پاؤ اور نا ہی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

سن پاؤں۔ جب جیل کسٹڈی میں دیا گیا اور بند وارڈ میں رکھا گیا تو یہاں چند دن بعد ظفر اللہ نامی ایک بلوچ میری کھال کھوٹری میں ڈالا گیا اس سے میری تنہائی میں کچھ کمی ہوئی۔ ظفر اللہ کو بند وارڈ اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ اس نے میری طرح کا کوئی جرم کیا ہے بلکہ اس کے بند وارڈ ہونے کی وجہ جیل میں ہونے والا کرپشن ہے۔ یہاں بیرک میں ڈالنے سے پہلے قیدی سے بھاری رقم وصول کی جاتی ہے۔ ظفر اللہ سے پیسے مانگے جاتے ہیں جس کا دینے سے وہ بے چارہ عاجز ہے تو وہ بھی یہی میرے ساتھ رہ رہا ہے جب اس کی ملاقات آتی ہے تو باقاعدہ اس پر قیدی مامور کیے جاتے ہیں کہ اپنے ملاقاتی سے پیسے مانگو۔ اس طرح سے بہت ناروا سلوک ہوتا ہے اور یہ صرف ظفر اللہ کی کہانی نہیں ہے۔ یہاں ہر قیدی سے اس طرح کا پیسہ وصول کیا جاتا ہے۔ چونکہ میرا جرم بھی بہت بڑا ہے اس لئے مجھ سے پیسے ڈیمانڈ نہیں کیے گئے ورنہ باقی قیدی اس سے بھی ایک عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ خاص کر جو نئی آمد میں آتے ہیں۔ یہ پیسے وصول کرنے والا ٹاور انچارج احسان مہر ہے جس نے اس کام کے لئے ان قیدیوں میں سے ایک سرغنہ مامور کیا ہے جس کو یہاں (بیڈر) بولتے ہیں اور اس نے قیدیوں کا ایک بدمعاش گروپ بنایا ہوتا ہے اور یہ کام کرنے والا یہاں کا سرغنہ اب سلیم نامی ایک قیدی ہے۔ کہتے ہیں کہ منشیات کے جرم میں 25 سال سزا یافتہ ہے۔ افسوس جب وہ باہر دنیا میں آزاد تھا تب منشیات سے لوگوں کی زندگیاں تباہ کرتا ہوگا اور آج جب وہ جیل میں ہیں تو کرپٹ نظام اسے سدھرنے نہیں دے رہی اور یہاں بھی وہ ظلم کر رہا ہے۔ کہتے ہیں اسطرح کروڑوں روپے وصول ہوتے ہیں جو کافی اوپر تک جاتے ہیں۔ بند وارڈ میں پیشی پر آئے ایک قیدی نے مجھے گلاب نامی ایک بیڈر کی کہانی سنائی کہ ایک دفعہ اس نے ایک قیدی سے پیسے وصول کرنے تھے۔ جب اس قیدی کی ملاقات میں اس کی ماں اور بہن آئی تو وہ اس کے سر پر کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ اس سے پیسے کا کہو، قیدی نے اسے کہا کہ ہم بہت غریب ہیں کہاں سے پیسہ لائیں، گھر میں میری ماں اور بہن کے سوا کوئی نہیں ہے تو گلاب نے اسے کہا کہ ان کو کہو کہ اپنی عصمت فروشی سے پیسہ کما کر

(c) ketabton.com: The Digital Library

لائے۔ اس قیدی کے اختیار میں اور کچھ نہ تھا اس نے یہ ماجرا اپنے قیدی ساتھیوں کو بتایا اور خودکشی کرلی۔ قیدیوں نے ملکر گلاب کو جیل کے اندر قتل کر دیا۔ واللہ اعلم

یعنی اتنا ظلم ہوتا ہے، اب یہاں ظفر اللہ نے 5000 روپے بھی دے دیئے ہیں جو کہ اس کے ایک دوست نے ادا کر دئے ہیں مگر وہ زیادہ رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ظفر اللہ ایک غریب بلوچ ہے جو ریاستی اداروں کی بے لگامی کا شکار ہوا ہے۔ ظفر اللہ کا اپنے آبائی گاؤں میں علاقے کے سردار کے ساتھ زمین پر تنازع ہوا، زمین کے کاغذات سمیت ہر چیز ظفر اللہ کے والد کے نام ہے مگر سردار نے ایک نہ مانی بلا آخر سردار کے مختلف ہتھکنڈوں سے تنگ آکر اس نے اپنا وطن چھوڑ دیا۔ اپنے وطن کو چھوڑے ہوئے 15 سال ہو گئے ہیں مگر وہ پرانی مخاصمت جو سردار کے ساتھ ہوئی تھی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بلوچستان میں کوئی بھی سردار انٹیلی جنس اداروں کے بغیر کام نہیں کرتا یعنی جو کسی کا سورس نہیں ہے وہ پھر باغی ہے اس نے پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں۔ ظفر اللہ بھی اس کا نشانہ بنا چونکہ اس کے مخالف حساس اداروں کے ساتھ کام کرتے ہیں چنانچہ 21 جنوری کو رات کے تین بجے اس کو رشتہ دار کے گھر سے کراچی میں سی آئی ڈی والوں نے اٹھایا اور کئی دن تک اس پر تشدد کرتے رہے۔ ظفر اللہ نے اپنی ماضی کی پوری کہانی انہیں بتائی کہ میرا کیا، میرے پورے خاندان کا کسی تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ہاں البتہ میری خاندانی دشمنی ہے۔ اس پر بی ایل اے کے ساتھ کام کرنے کا الزام لگا دیا گیا تھا جبکہ اس نے بتایا کہ آخر کس بنیاد پر آپ یہ کہہ رہے ہو۔ کوئی ایک ثبوت تو بتاؤ، اور نہیں تو اتنا ہی ثابت کرو کہ میں نے کسی کے ساتھ فون پر بات چیت کی ہو۔ ظفر اللہ کے مطابق اسے بلا آخر سی آئی ڈی کے افسر نے بتایا کہ ہم کو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تمہارا مسئلہ واقعی پیچھے خاندانی دشمنی کا ہے مگر ہم اوپر سے مجبور ہیں ظفر اللہ نے اسے کہا کہ "جب سب کچھ تمہارے سامنے واضح بھی ہو گیا ہے تب بھی مجھے کسی کیس میں ڈالو گے تو تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، اس سے مت ڈرو جو اپنا بدلہ لینا جانتے ہو، بلکے اس سے ڈرو جو اپنا بدلا اللہ پر چھوڑتے ہوں"۔ سی آئی ڈی کے افسر نے اسے کہا کہ ہم مجبور ہیں مگر میں تمہیں کسی چھوٹے کیس

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں ڈال دوں گا، اسے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا اور جیل لایا گیا۔ چند دن بعد اس کا دوست ملنے آیا اور کہا کہ ٹی وی پر تمہاری خبر چلی کہ (بی ایل اے) کے ایک دہشتگرد کو گرنیڈ اور رائفل سمیت گرفتار کیا گیا ہے جس کا نام ظفراللہ ہے۔ جب ملاقات سے واپس آیا تو پریشان ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے پرانے اور پیوند لگے چپلوں پر نظر پڑی تو ہنسنے لگ گیا کہا کیا میں ان چپلوں کے ساتھ گرنیڈ اور رائفل لے کر ایم اے جناح روڈ پر جا رہا ہوں گا اور میں بغیر مزاحمت کے ان کے ہاتھ آ جاؤں گا۔ پھر ہنستے ہنستے اچانک رونے لگ گیا کہ یار ان ظالموں نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ میرے بچوں کا کیا ہو گا جس کا میں واحد کفیل ہوں اور اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دینے کا خواں ہوں۔ میں اس کی ہمت باندھتا ہوں کہ انشااللہ تمہیں ضرور آزادی ملے گی اور تمہارے بچے ضرور پڑھیں گے۔ میں اس کی تکلیف سب سے زیادہ سمجھ اور محسوس کر سکتا ہوں۔ میری قوم کے ساتھ بھی تو یہی ہو رہا تھا اور کر رہے ہیں۔ ان کا تو کاروبار ہی یہی ہے کہ پختونوں بلوچوں اور مہاجروں اور سندھیوں کی ایسی پروفائل کی جائے کہ جس کو بھی پکڑیں تو ان پر ایک مخصوص کیس ڈال سکیں یعنی پختون ہو گا تو طالبان کا کیس اور ان کا سہولت کار، بلوچ ہو گا اگر بلوچستان سے ہو گا تو (بی ایل اے) سے تعلق کا کیس، اگر کراچی کا بلوچ ہو گا تو گینگ وار کا کیس، مہاجر ہو گا تو ایم کیو ایم اور (انڈیا کی ایجینسی راہ) کا تانا بانا جوڑا جائے گا۔ یہ بھی خوش قسمت ہوں گے ورنہ جو ان کا پیسہ نہ دے سکے تو ماورائے عدالت قتل ہو جائے گا۔ نقیب اللہ محسود کا قتل بھی یہی تھا کہ جب وہ بیچارہ پیسے نہ دے سکا تو شہید کر دیا گیا اور راؤ انوار نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ طالبان کا کارندہ تھا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ لوگوں نے فورا یقین کر لینا ہے کہ اگر پختون ہے تو لازمی طالبان میں ہو گا۔ اگر پختون قوم اس پر کھڑی نہ ہوتی تو شاید راؤ انوار کے سینے پر ایک اور میڈل بھی چسپاں ہو جاتا۔ اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اس کی ذمہ دار افسوس کے ساتھ ہمارے ملک کے عسکری ادارے ہیں جنہوں نے خود طالبان بنائے جب کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہماری پروفائلنگ کی کہ یہی لوگ ہیں جن کا کوئی کام ہی نہیں سوائے دنیا بھر میں دہشت گردی کرنا۔ باقاعدہ آئی ایس پی آر کی مدد سے فلمیں بنائی گئیں اور ہر دہشتگرد کو

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پختون کا روپ دیا گیا۔ میرا جرم یہ بھی ہے کہ میں نے یہ بات پوری دلیل اور ثبوت کے ساتھ کی۔ بجائے یہ کہ وہ اپنے اس طرز عمل کو تبدیل کرتے ان کو مجھے ٹھکانے لگانا زیادہ بہتر لگا لیکن یہ مسئلہ میرا ذاتی تو کوئی نہیں ہے۔ یہ تو میری قوم تھی جن کا ان اداروں کو ڈر تھا ورنہ تو شاید مجھے مار کر پھینک دیتے۔ لیکن کیا مجھے قتل کرنے سے یا مجھے پابند سلاسل کرنے سے پختون کا مسئلہ حل ہوگا، اگر مسئلہ اس طرح حل ہوتا ہے تو میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ ساری عمر کے لئے مجھے قید کر دیا جائے اور اگر میری قوم کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تو میں تو کیا میرے جیسے لاکھوں بھی قید کرو گے یا قتل کردو گے تمہاری یہ مطلق العنانی، قوموں کے حقوق سلب کرنا، ان کی قومی شناخت خراب کرنا تمہیں ایک دن بہت مہنگا پڑے گا اور یاد رکھو جو تاریخ سے نہیں سیکھتے، تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

12 فروری 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی سیکورٹی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں یہ کیسے مان لوں کہ یہ ایک ریاست ہے

آج 23 فروری کا دن ہے جیل میں ہر دوسرے ہفتے جیل سپریڈنٹ کا چکر لگتا ہے جس میں وہ قیدیوں کی شکایات سنتا ہے۔ شکایات پر کچھ عمل درآمد بھی ہوتا ہوگا لیکن میرے معاملے میں اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوتا۔ آج ہفتے کے روز جیل سپریڈنٹ کا چکر تھا میں نے پچھلی بار کی طرح اس بار بھی وہی شکایات کی کہ مجھے نہ تو پڑھنے کے لئے کچھ دیا جاتا ہے اور نہ مجھے کال کوٹری سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اس نے سن کر یہ کہا کہ میں کچھ کرتا ہوں لیکن کوئی عمل درآمد نہیں۔ میرے لئے یہاں ایک تکلیف دہ چیز قیدیوں پر تشدد بھی ہے۔ یہاں پر قیدیوں کو لاکر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان سے پیسے وصول کیے جاتے ہیں اور پیسے وصول ہونے کے بعد انکو بیرکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اور جو بیچارے پیسے نہیں دے پاتے ان پر بدترین تشدد ہوتا ہے اور سب کچھ میرے آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ مجھے اپنی بے بسی پر بہت غصہ آتا ہے۔ اے خدا کیا حال ہے تونے مجھے سلاخوں میں نہ ڈالا ہوتا یا پھر اتنی سقت بھی دی ہوتی کہ میں ان کے گریبان پکڑ کر پوچھتا کہ تمہارے باپ کے پیسے دینے ہیں جو اتنے بھرم سے اور زیادتی سے پیسے نہ دینے کی سزا ان کو دے رہے ہو، کیا جیل خود ایک سزا نہیں ہے جو اوپر سے اور بدترین سزا مسلط کر دی گئی ہے ان بیچاروں پر۔ کتنے بے حس ہیں یہ پولیس والے، مجھے وہ کہانی یاد آئی جس میں ایک لڑکا ایک بزرگ سے پوچھتا ہے کہ کیسے پودے ہیں جو اُگ تو آئے ہیں مگر بڑھتے ہی نہیں، بزرگ نے کہا، بیٹا یہ بے حسی کے پودے ہیں۔

جیل میں پولیس والوں کی بے حسی پر کیا رویا جائے اس ملک میں ہر وردی والے کے چہرے پر بے حسی نمایاں نظر آتی ہے جس کو دیکھو، اپنے ہی ہم وطنوں پر ظلم کرتا ہے، بے عزت کرتا ہے۔

میں کس طرح سے مان لوں کہ میں ایک ریاست میں ہوں۔ ریاست وہ جس میں ادارے ہوں جو سب اپنے حدود میں کام کریں اور ان سب کے بنانے میں ایک ہی بات مظہر ہوتی ہے کہ اس ریاست کے باسی کس طرح اچھی اور پرسکون زندگی گزارے یعنی لوگ ہیں جن کے لیے ریاست بنتی ہے، ریاست کے لیے لوگ نہیں بنائے جاتے۔ اس ملک کا ستر سال قبل نام ونشان نہ تھا، جب

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

بنا تو بننے کے 25 سال بعد اس کے ایک حصے کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس ریاست میں رہنا ہمارے لئے نقصان دہ ہے تو کتنا ہی جبر ہوا لیکن دنیا نے خطہ زمین پر ایک نئی ریاست کو ابھرتا دیکھا۔ یہ کہانی کوئی نئی نہیں ہے، جب سے بابا آدم نے اس زمین پر قدم رکھا تاریخ شاہد ہے کہ ہزارہا ریاستیں بنی اور تباہ ہوئیں۔ جس زمین نے انسان کے پیٹ کو پالا، انسان نے اس زمین کی پرستش کی مگر جیسے زمین کے خطے پر خشک سالی یا کوئی اور آفت آئی تو انسان نے بھی اسے ایسے چھوڑا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آثار قدیمہ سے ہزاروں سال پرانی ایسی تہذیبیں بھی دریافت ہوئی ہیں جو اپنے وقت میں کامیاب ریاستیں تھیں مگر آج وہ آثار قدیمہ ہے۔ لوگوں کی کسی ریاست سے وفاداری صرف اس وقت تک ہے جب تک اس کی جان مال اور عزت محفوظ ہے، اسے انصاف ملتا ہو اس پر ظلم نہ ہوتا ہو۔ ایسی حالت میں وہ اس ریاست کے لئے مرنے اور مارنے پر اتر سکتا ہے کیونکہ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اگر دوسرے یعنی اغیار نے اس پر قبضہ کر لیا تو میرے یہ مفادات جاتے رہیں گے۔ مجھ سے جب میری گرفتاری کی پہلی رات انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا کہ تمہیں پتا نہیں ہے کہ ریاست ماں ہوتی ہے اور تم لوگ ماں کو گالی دیتے ہو ایک گھر میں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے مگر ماں کو گالی نہیں دی جاتی۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی اور ہاتھوں اور پاؤں میں بیڑیاں تھی اب اسے کیا سمجھاتا کہ ماں کس بنیاد پر ہے مگر اتنا کہا کہ آپ کی پہلی بات تو غلط ہے کہ اس سو کالڈ ریاست کو ماں کہہ سکتے ہیں، مگر دوسری بات معمولی بنا کر مت پیش کریں کیونکے ایک بھائی سراسر ظلم کر رہا ہے، قبضہ کیے ہوئے ہے۔ میں منظور پشتین کا ساتھی باچا خان اور خان شہید کا پیروکار، جالب اور فیض کا ہم جماعت اور وہ پرویز مشرف کے ساتھی ضیاء الحق اور یحیی خان جیسے اوباشوں اور بدمعاشوں کے پیروکار، میری آنکھیں بند اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور وہ وہی کام کرتے رہے جو آج تک ہماری قوم کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ مجھے یہ قتل بھی کر دیں تو میرا سوال تو ویسے کا ویسا ہی ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ یہ ایک ریاست ہے۔ جس ریاست میں عدل کا دوہرا معیار ہو کہ جہاں تین دفعہ وزیر اعظم بننے والا نواز شریف جیل جا سکتا ہے مگر لاکھوں انسانوں کا قاتل اور آئین کو

(c) ketabton.com: The Digital Library

توڑنے والے پرویز مشرف کو سزا سے بچا لیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ دلیل دی جاتی ہے کہ پرویز مشرف کو سزا لگنے سے فوج کا مورال مجروح ہوگا، کیا نواز شریف کو سزا لگنے سے پارلیمنٹ کا مورال مجروح نہیں ہوتا؟ یہاں آئے روز نیب کسی نہ کسی بیوروکریٹ کو کالروں سے پکڑ کر لے جارہی ہوتی ہے کیا ایسے میں بیوروکریسی کا مورال مجروح نہ ہوگا۔ یہاں آئے روز پولیس واپڈا سمیت کئی اداروں کے خلاف جلسے جلوس نکلتے ہیں اور کتنے ہی نازیبا کلمات ادا ہوتے ہیں، کیا ان کا کوئی مورال نہیں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ میں احتساب کے خلاف ہوں مگر میں سلیکٹیو اکاؤنٹیبلٹی کے خلاف ہوں کہ کسی جرنیل کا احتساب اس ملک میں کیوں نہیں ہوسکتا؟ لوگ کہیں گے میں سرمایہ کاری کے خلاف ہوں مگر میں یہاں دولت کے مخصوص اداروں کے ہاتھوں میں ارتکاز کے خلاف ہوں۔ کیا اس ملک میں بیوروکریسی پارلیمنٹ اور دیگر جو ادارے ہیں کیا وہ بھی ہاؤسنگ سوسائٹیز، فرٹلائزر، شوگر ملز، تعمیراتی منافع بخش کمپنیاں بناسکتی ہیں؟

لوگ کہیں گے میں قانون کی عملداری کے خلاف ہوں مگر میں اس طرز عمل کے خلاف ہو جس میں عوام کے لئے تو ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جس میں ایک شہری کو مہینوں تک غائب رکھا جاسکتا ہے لیکن اس شہری کے نام کے آگے کوئی کرنل جنرل کا اضافہ ہوگا تو اس کے ساتھ ہر گز ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اعلیٰ اور ادنیٰ یہ کا قانون کب تک چلے گا۔ ایک ادارہ جو سپیریئر بنا ہوا ہے جو قوانین بھی اپنے لئے بناتا ہے، قانون نہ ہو تو خلاف قانون بھی چلتا ہے۔ جو فارن پالیسی بھی وہی بناتا ہے، اندرونی طور پر بھی حکمرانی دینے اور لینے کا خود کو حقدار گردانتا ہے جو جس کو چاہے محب وطن کہے جس کو چاہے غدار کہے۔ میری باتیں تلخ صحیح مگر ان سوالوں کا جواب نہ ڈھونڈا گیا تو اس ملک نے کہی آگے نہیں بڑھنا۔ یہاں ہونے والا ظلم اور ناانصافی ایک دن ایسا اژدھا بن جائے گا کہ جو ظلم سمیت ملک کو بھی نگل جائے گا۔ اس ملک میں ایک کلاس اُبھری ہے اور مزید اُبھر رہی ہے جس کا رہن سہن، روزگار کے مواقع اور انصاف کا حصول باقی ملک سے علیحدہ ہے اور مزید ہوگا۔ وہی کینگ میکرز بھی ہیں اور وہی آنے والی سرمایہ کاری پر پلتی مار کر بیٹھے ہیں۔ تمام منافع بخش کاروبار وہ خود

(c) ketabton.com: The Digital Library

کریں گے۔اس کے مقابلے میں باقی عوام کے کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے۔ معلومات تک صرف ان کی رسائی ہو گی اور اس معلومات سے اپنے لئے خوب منافع حاصل کریں گے یہ کلاس چالیس سے پچاس لاکھ لوگوں کی ہو گی اور یہ عسکری کلاس ہو گی جس کا تعلق فوج اور اس سے وابستہ شاخوں سے ہو گا۔اس کے مقابلے میں 23 کروڑ عوام کی معیار زندگی گرتی چلی جائے گی، باقی ادارے مفلوج ہو کر رہ جائیں گے بس ان کا کام صرف عام عوام کو نچھوڑنا ہو گا۔ عسکری کلاس اپنی ترقی کو ملک کی ترقی پر تعبیر کریں گے، مگر آخر کار عوام میں ناامیدی اور معاشی و معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی بحران اتنی شدت اختیار کرے گا کہ وہ زوردار دھماکہ ہو گا کہ ریاست کے تمام جز بکھر کر رہ جائیں گے۔ایک سوشل پولیٹیکل ایکٹیویسٹ کی یہی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ یہ حقائق بیان کریں اس امید کے ساتھ کہ شاید یہ اپنا قبلہ درست کرلے۔ مجھے کہا گیا کہ میں نے انہیں بدنام کیا مگر سچ یہ ہے کہ میں نے کچھ بھی کسی کو بدنام کرنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی اس کی پرواہ کرتا ہوں کہ اس سے کون بدنام ہوتا ہے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ میری مٹی جو آج بربادی کے ساتھ لڑ رہی ہے، اسکے ذمہ دار کون ہیں؟ میں ان ذمہ داروں کا نام بھی لونگا اور میرے وطن میں ہوئی بربادی سے متعلق حقائق بیان کروں گا چاہے یہ باتیں تمہیں کتنی ہی بری لگتی ہو۔

اب کیا کیا جائے؟ یا ان کو اسی روش پر چھوڑ دیا جائے جس کا یہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ ان کی خدائی کا دعوی رکھنے والی روش ہے۔ حکمران بنانے اور بگاڑنے کا اختیار لینا ایک خدائی دعویٰ ہے، لوگوں کو عزت اور ذلت دینے، لوگوں کو غائب کرنے اور ماورائے عدالت قتل کرنے کی روش ایک خدائی دعویٰ ہے۔افسوس ہمارے چند مذہبی رہنما بھی اِسے نہیں سمجھتے۔ میں نے ایک مولانا صاحب کو سنا تھا سوشل میڈیا پر اس کی کافی ویڈیوز آتی ہیں۔ کہنے لگے شکر ہے کہ فوج جمہوریت کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی کیونکہ فوج تو اس ملک کے سب سے زیادہ وفادار ہے۔ وہ بہتر جانتے ہیں کہ کون ملک کے لئے ٹھیک ہے اور کون غلط۔

Scanned with CamScanner

حالانکہ ہم نے دیکھا کہ جب بھی ایک ڈکٹیٹر کی حکمرانی آئی اس نے اغیار کے لیے ملک کی عزت و ناموس اور مذہب اور اخلاقیات کو برائے فروخت رکھ دیا۔ یہاں بہت طریقے اور جبر سے لوگوں کی ذہن سازی ہوئی ہے۔ ان کو سمجھانا آسان نہ ہوگا کہ ایسی سوچ غلط بلکے کفر ہے یعنی اگر کسی کو محب وطن یا غدار کہا جائے تو کس بنیاد پر کہا جائے۔ قرآن شریف میں اللہ فرماتا ہے کہ "جو کوئی اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں تو وہ نہ کریں علم کے بغیر بات یا دلیل کے بغیر یا روشن تحریر کے بغیر" یعنی اگر کسی کو یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ غداری یا حب الوطنی کے ٹکٹ بانٹے، لوگوں کو ماورائے عدالت غائب یا قتل کرے، اپنے لوگوں کو احتساب سے بچائے، اپنی فلاح اور نفع کو جس قدر چاہے زیادہ کرے تو ان کو یہ اختیار بلکل دیا جائے، مجھ سمیت کسی بھی شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے مگر بتایا جائے کہ آخر کس علم کے تحت، کیا آج کی جدید پولیٹیکل سائنس یا اسلامی تعلیمات اس کی اجازت دیتی ہیں؟ کس دلیل کے تحت، کیا ان کے پاس مزکورہ اختیارات رکھنے کا کوئی بھی معقول دلیل موجود ہے؟ کس روشن تحریر کے تحت، کیا ان کے پاس کوئی خدائی کتاب اتر آئی ہے یا اختیارات ان کو قرآن نے تفویض کیے ہیں؟ یا ہم نے ان کے ساتھ ایسا تحریری معاہدہ کیا ہے جیسے "آئین" کہ جس کی بنیاد پر ان کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے؟ اگر ان تینوں سوالوں پر جواب "نہ" میں ہے تو ہم کو جتنا بھی مارو پیٹو یا پھر مار ہی ڈالو یا جیلوں میں پابند سلاسل کر دو، ہمارے اس حق کی آواز کو کبھی نہ دبا سکو گے اور نہ ہی خرید سکو گے۔

عالم زیب محسود

23 فروری 2019

سینٹرل جیل کراچی سیکورٹی

(c) ketabton.com: The Digital Library

لاپتہ افراد کے معاملے کی طرف میری رجوع

ہر انسان جب کسی کام کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوتی ہے پورے افغان بیلٹ میں تو ویسے جنگ و جدل سے ایسے ایسے ظلم رونما ہوئے ہیں کہ کسی ایک پر زیادہ دھیان دینا باقی مسائل کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔ اپنے بچپن سے جوانی کی طرف سفر کرتے ہوئے یہ بات کم از کم مجھ میں سرائیت کر گئی تھی کہ ہو نہ ہو کسی کو لاپتہ کر دینا بہت بڑا ظلم ہے جبکہ تب میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہمارا آئین یا اس کے بارے میں بین الاقوامی قوانین کیا کہتی ہیں۔ لوگ اٹھائے جاتے تھے اور چند واپس بھی آجاتے تھے اور پھر ان کی آپ بیتی سن کر دنگ رہ جاتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے پر بات کرنا بھی ایک خوفناک چیز تھی، جسکے آواز اٹھانا تو گویا موت کو دعوت دینا تھی۔

یہ کمیٹمنٹ کہ جب بھی موقع ملا تو لاپتہ افراد کے لیے ضرور آواز اٹھاونگا، وہ سال 2014 تھا کیونکہ اُس سال عبدالغنی کو اٹھایا گیا تھا۔ عبدالغنی میرے والد صاحب کے کزن لگتے تھے۔ خدا نے اس کو کیا ہی شخصیت عطا فرمائی تھی، سب ہی ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور وہ تھے بھی اس کے لائق۔ قومی کاموں میں سب سے آگے آگے رہتے تھے۔ یہ ایک چیز تو میرے پردادا ترین خان سے اسے وراثت میں شاہد ملی تھی. کسی کی فوتگی ہوتی یا شادی بیاہ، عبدالغنی ایسی خدمت کرتے گویا اسکے اپنے گھر میں یہ سب ہوا ہے۔ بہادری میں بھی ایسے، کہ کم ہی اپنی جان کی پروا کرتے۔ 2007 میں جب ہمارے علاقے میں طالبان پوری طرح سے قابض تھے تب انہوں نے نہ ہمارے مشران چھوڑے اور نہ ہی ایسے لوگ جو کچھ شعور رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے والد صاحب جو کہ خود ایک سیاسی اور سماجی شخص ہیں، کو طالبان کے لدھا کے امیر نے پورے جرگے کے سامنے 500 روپے لہرا کر میرے والد کے طرف پھینکے تھے کہ اس پر اپنے لئے کفن خرید لینا۔ ایسے وقت میں طالبان نے ہمارے گاؤں سے متصل ایک گاؤں کے ایک بندے کو رات گھر سے اٹھالیا۔ صبح جب ہوئی تو سارے علاقے والے جرگہ بنا کر طالبان کے دفتر گئے مگر انہوں نے صاف

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

انکار کر دیا کہ ہم نے ایسے کسی شخص کو نہیں اٹھایا. لوگ مجبور تھے اور پھر انتظار کرنے لگے کوئی 14 دن بعد خبر ملی کہ فلاں جگہ پر لاش ملی ہے۔ معلوم ہوا وہی بندہ تھا جس کو طالبان اٹھا کر لے گئے تھے۔ ایسے میں لاش کو اٹھانا بھی خود کو خطرے میں ڈالنا تھا لیکن عبدالغنی ایسے شخص تھے جو ایسے ضروری موقعوں پر کوئی بھی خطرہ مول لے لیتے تھے اس نے نہ صرف لاش اٹھائی بلکہ اس کے غسل اور صندوق میں رکھنے کے تمام کام بخوبی انجام دئے اور دیگر تمام ضروریات پورے کئے۔ اس طرح جانے کتنے ہی لوگوں کی اس نے مدد کی تھی۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ہمارے علاقے میں روڈ بن رہی تھی قبائلی علاقے اتنے پسماندہ ہیں کہ اب تک ہمارے گاؤں تک روڈ نہیں آئی۔ جب ہمارے علاقے میں روڈ بن رہی تھی تو مجھے یاد ہے کہ ہم بچے بھی پورے علاقے کے لوگوں کے ساتھ روڈ کی تعمیر دیکھنے جاتے تھے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے کہ جس کی جائیداد میں روڈ آتا تھا، وہ وہاں روڈ کے بننے کو منع کر دیتے۔ پھر مجبوراً کام کو روکنا پڑتا۔ ایسا ہی جب ایک دفعہ ہوا تو روڈ کے بنانے والے بلڈوزر سے ڈرائیور نیچے اتر گیا کیونکہ اس کو دھمکی ملی تھی. کام رک گیا مگر عبدالغنی نے نہ صرف بہادری دیکھائی بلکہ لوگوں کو اس وقت حیران کر دیا جب ڈرائیور سے چابی لے کر خود ہی بلڈوزر پر بیٹھ گیا اور پھر بڑی کامیابی سے چلانے بھی لگا۔ کبھی کبھی ہم کہتے کہ اگر عبدالغنی کو ہیلی کاپٹر بھی اڑانے کو دی جائے تو شاید وہ بھی اڑا لے کیونکہ وہ ہر قسم کی گاڑی چلا لیتا تھا۔ وہ بالکل ناخواندہ تھا لیکن اللہ نے اس میں ٹیلنٹ اور اخلاق اور لوگوں کی خدمت کا مادہ ایسا ودیعت فرمایا تھا کہ اس سے ہمارے علاقے کی عوام اس کی گرویدہ تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ان کا گھر دیہات میں تھا اور وہاں بجلی کم ہی آتی ہے تو وہاں رمضان میں شہر آ کر اپنی گاڑی کو برف سے بھر لیتا تھا اور دیہات میں بانٹ لیتا تھا اس طرح اگر سیلاب آ جاتا تو کہیں سے امداد لے کر بانٹتا۔ علاقے کے سب جوانوں کو لانگ ٹور پر لے جاتا اور جوان تو اس پر جان چھڑکتے تھے لوگ کہتے کہ اگر عبدالغنی 80 سال کا بوڑھا بھی ہو گیا تو اس کا دل 20 سال کے جوان کی طرح ہی رہے گا. اس نے اپنے گھر کو تو کما کر نہیں دیا بلکہ اس کے والد کو اس کی وجہ سے مالی مشکلات بھی اٹھانا پڑیں لیکن اس نے جو کمایا وہ فقط لوگوں کے دل

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اور دعائیں تھیں اور یہی اس کا سرمایہ تھا۔ 2014 کے غالباً شروع کے دنوں میں وہ اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ اسلام آباد گئے تھے اور وہاں اپنے ایک کزن کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات کو سیکورٹی فورسز نے اس کو اپنے دو ساتھیوں سمیت اٹھالیا پھر کیا تھا جس نے بھی اس کو ایک دفعہ بھی دیکھا تھا اسے افسوس ہوا مگر جیسا کہتے ہیں کہ جلتی وہ جگہ ہے جہاں آگ لگی ہو۔ یہ غم کے نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا اس کو تشدد کا نشانہ تو نہیں بنایا جا رہا ہوگا، کہیں قتل تو نہیں کر دیا گیا، قتل کیا ہے تو کہاں پھینکا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی یہ ڈر اور تشویش برابر دل میں بیٹھے رہنا کہ اب کی بار جو اخبار میں خبر چھپی ہے یا کسی کی زبانی سنی ہے کہ فلاں جگہ مسخ شدہ لاش ملی ہے کہیں یہ عبدالغنی نہ ہو اور پھر اسطرح دن اور رات چوبیس گھنٹے انتظار کہ ابھی بس آتا ہی ہوگا یا کوئی یوں ہی جاننے والا ملاقات کے لیے آتا تو پہلا ڈر یہی دل میں ہوتا کہ شاید یہ عبدالغنی کی موت کی خبر لایا ہے۔ یہ غم و رنج والم صرف اور صرف وہی خاندان محسوس کر سکتا ہے جس کے گھر سے کوئی لاپتہ ہوا ہو۔ اس دکھ اور درد کو شاہد زبان میں بیان کرنا بالکل ناممکن ہے اور یہ مسلسل سزا شاہد بدترین سزا متاثرہ خاندان کو برابر مل رہی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کئی دفعہ بات بھی کر چکا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں خاص کر جب سوشل ایکٹیویزم شروع کی تو بہت سارے کہانیاں سنی ہزاروں خاندانوں سے ملا مگر مجھے جو نتیجے کے طور پر لگتا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابل رحم اور مظلوم کون ہے، میں بڑی آسانی سے جواب دے دوں گا کہ لاپتہ افراد کے خاندان والے۔ عبدالغنی کو لاپتہ ہوئے مہینہ ہوا اور اس طرح مہینے سال میں تبدیل ہو گئے مگر کوئی سراغ نہ لگ سکا بالآخر غالباً دو سال بعد میں اپنے ایک عزیز کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا تب ان کو خبر آئی کہ فلاں آدمی کو ملتان روڈ پر پھینکا گیا ہے۔ ابھی ہسپتال کے سرد خانے میں پڑا ہے۔ یہ آدمی ان دو آدمیوں میں سے ایک تھا جو عبدالغنی کے ساتھ گئے تھے۔ میں بھی فوراً ان کے ساتھ ہسپتال چلا آیا۔ راستے میں مجھے پتا چلا کہ اس کے پانچ بچے ہیں جن کو اسکولوں میں پڑھا رہا تھا۔ غربت تھی مگر حلال رزق کمایا کرتا تھا یعنی کم از کم ان کے رشتہ داروں کو اس کے کسی بھی طرح سے کسی ریاست مخالف سرگرمیوں میں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ملوث ہونے کا کوئی شبہ نہیں تھا۔ جب سرد خانے میں اس کی لاش دیکھی تو اس کے چہرے اور پیٹ پر زخموں کے بڑے بڑے نشان تھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے جلد نیلی ہو گئی ہو گولی لگنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ موت سخت گرمی کی وجہ سے ہوئی ہے لیکن زخموں کے نشان تشدد کی بھی ایک ہولناک کہانی سنا رہے تھے۔ جب گھر آیا تو اپنے گھر والوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھا، سوچا کہیں عبدالغنی کے گھر والوں تک بات نہ پہنچ جائے مگر چند دن بعد معلوم ہوا کہ نہ صرف ان کے گھر والوں کو پتہ لگا تھا بلکہ ان کی طرف سے ہمارے گھر تک بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ عبدالغنی کے گھر میں یہ ایک اور قیامت تھی۔ لاپتہ افراد کے خاندان والے ایسی صورتحال کا سامنا کرتے ہیں کہ جیسے کہتے ہیں کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہ مظلوم خاندان در در پر جانے کے بعد مایوس ہو جاتے ہیں تو پیر فقیروں کے آستانوں پر حاضریاں دینے لگتے ہیں۔ پھر وہ بھی دم و درود اور تعویزوں سے ان کو لوٹنے لگتے ہیں۔ عبدالغنی کے خاندان والوں کو کسی نے ایک مہینے میں عبدالغنی کو واپس لانے کا دعوی کیا تو کسی نے ایک ہفتے میں، خاندان والے اس مہینے اور ہفتے کے ایک ایک سیکنڈ کو انتظار میں گزارتے اس طرح ایک کہانی مجھے ایک لاپتہ بندے کے والد نے سنائی تھی کہ اسے ایک عامل نے کہا کہ اتنے لاکھ روپے دو میں تمہارے بیٹے کے لیے چیلا کاٹونگا اور بتاؤں گا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس نے بتایا کہ میں نے پیسے دیے اور مقررہ وقت پر اس کے آستانے پر گیا، عامل نے بتایا کہ تمہارا بیٹا مہمند ایجنسی کے فلاح جگہ پر ایک سرائے میں قید ہے۔ اس نے اس سرائے اور اس علاقے کا پورا نقشہ بتا دیا۔ بابا نے بتایا کہ میں نے فوراً اپنے ایک رشتہ دار کو ساتھ لیا اور کراچی سے مہمند ایجنسی کے لئے روانہ ہوا سوچا کہ اگر ہم اس طرح علاقے کا نام اور جگہ معلوم کرتے رہے تو کہیں یہ خبر اس ادارے تک نہ پہنچ جائے جنوں نے اسے وہاں رکھا ہے تو ہم نے بچوں کا سامان لے کر تاجر کی حیثیت سے مومند ایجنسی کے اندر گئے۔ اس طرح چند دنوں میں ہم اس علاقے تک پہنچ گئے اور وہ سرائے بھی ڈھونڈ نکالا۔ سچ کہتے ہیں کہ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے اندھے ہو جاتے ہیں اور کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ بابا نے بتایا کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ رات کا انتظار کرتے ہیں پھر اس کے بعد باہر دیوار میں سوراخ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کر کے اندر گھس جائیں گے۔ جب رات ہوئی اور ہم نے سوراخ بھی کر دیا مگر ابھی وہ پورا کھلا نہیں تھا کہ بندہ اس میں سے نکل سکے مگر میرا دل اتنا بے چین ہو گیا کہ میں نے سوراخ سے قبل از وقت نکلنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں جاکر پھنس گیا۔ بالآخر اتنا زور لگایا کہ میرے کپڑے بھی پھٹے اور جسم پر بھی شدید چوٹیں آئیں۔ جسم سے خون سرکنے لگا لیکن میں دیوانہ وار پورے سرائے میں اپنے بیٹے کو تلاش کر رہا تھا۔ جب تک کہ دوسرا بندہ اس سوراخ کو کھلا کر کے اندر آ گیا۔ اس نے جب اندر دیکھا تو مجھے سنبھالتے ہوئے کہا کہ چاچا یہ سرائے تو کئی سال سے بند لگتا ہے، بالکل کھنڈر بنا ہوا ہے۔ فوج یہاں کیوں کسی کو رکھے گی۔ تب میرے ہوش ٹھکانے آئے کہ واقعی یہ سرائے تو ایک کھنڈر تھا مگر پھر بھی ایک دفعہ پھر سے سرائے کو چھان مارا مگر مجھے میرا بیٹا نہیں ملا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس عامل کو اس سرائے کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ صرف پیسہ بٹورنے کے لیے اس نے یہ ڈھونگ رچا کر اتنا ظلم کیا۔ عبدالغنی کے خاندان والے بھی ان مراحل سے گزرے۔ اس طرح کے لاپتہ افراد کے خاندان کو سیکورٹی اداروں کے اہلکار بھی لوٹتے رہتے ہیں اور اس کام کیلئے انہوں نے اپنے دلال گوڈ طالبان کی شکل میں رکھے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بندے چھوٹ کر آ بھی جاتے ہیں۔ عبدالغنی کے خاندان والوں نے ہمارے علاقے کے ایک ملک، کالام ملک کو پانچ لاکھ روپیہ ادا کیے جس نے کہا کہ یہ پیسے میں مصباح نامی گوڈ طالبان کمانڈر کو دونگا اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ ایک ہفتے میں بندہ باہر آ جائے گا اور باقی پیسے بندے کو چھوڑانے کے بعد وصول کرونگا مگر ہفتہ کیا کئی کئی مہینے گزر گئے مگر عبدالغنی کی رہائی کے بدلے دی گئی رقم ہضم ہو گئی۔ بعد میں جب پی ٹی ایم بنی اور ہم نے پی ٹی ایم کے پلیٹ فارم سے کئی خاندانوں کی مالی مدد کی تو انھیں یہ بھی سمجھاتے رہے کہ آپ کے پیارے کی رہائی اگر کوئی کرے گا تو وہ اسطرح آپ کی مالی مدد کرنے گا نا کے آپ سے پیسے لے گا، اسلئے کسی کو پیسے نہ دیا کریں۔ خیر عبدالغنی کو نہ تو واپس آنا تھا اور نہ وہ واپس آیا بلاآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ یہ 2016 کے 4 اکتوبر کی بات ہے جب میں یونیورسٹی سے گھر پہنچا تو دیکھا گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ایک دم خاموشی، صرف میری ایک بھابی گھر

Scanned with CamScanner

پر رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ گھر والے کدھر غائب ہیں اس نے کہا کہ کہیں گئے ہوئے ہیں اور فوراہی کھانا لا کر رکھ دیا۔ جیسے ہی میں نے کھانا کھالیا اور ہاتھ دھو کر واپس آرہا تھا تو میری بھابی رو دی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا ہے تو جواب دیا کہ عبدالغنی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ فوراً گھر سے نکلا اور مین روڈ پر گاڑی پکڑنے کی کوشش کی تاکہ مجھے عبدالغنی کے گھر پہنچادے جب وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ آج صبح کو خبر آئی کہ ٹانک روڈ پر تین لاشیں گرائی گئی ہیں ہسپتال پہنچے تو لاشیں پہچاننے کے لائق نہیں تھیں۔ بڑی بڑی داڑھیوں اور مونچھوں والے، جن کے چہرے اور سر گولیوں سے بری طرح مسخ ہوئے تھے۔ میرے رشتہ داروں نے بتایا کہ لاشوں کے ساتھ ان کے شناختی کارڈ بھی ملے تھے جس سے تصدیق ہوئی کہ ان میں ایک عبدالغنی ہے مگر کونسا والا ہے اس میں پزل ہوئے۔ عبدالغنی داڑھی منڈواتا تھا، مونچھ ہلکے رکھتا تھا۔ قد سے اونچا نہیں تھا لیکن جسم پوری طرح گوشت سے پُر تھا اور جسم پر اس کے بہت گھنے بال بھی تھے مگر یہاں تو حال یہ تھا کہ لاشوں کی داڑھی اور مونچھیں اتنی بڑی تھی کہ شاید اتنے سالوں میں ایک دفعہ بھی بلیڈ نہیں لگا تھا۔ اب جسموں سے پتہ لگانے کی کوشش کی گئی عبدالغنی کا جسم فربہ بھی نہیں تھا لیکن خوب پر گوشت تھا مگر یہاں تو لاشیں اتنی نحیف تھیں گویا کئی مہینوں سے بھوکے رکھے گئے تھے۔ اب ایک ہی نشانی بچی تھی، عبدالغنی کے جسم پر بال بہت تھے، یہاں تک کہ انگلیوں پر بھی تھے اور یہی چیز ان لاشوں میں سے ایک پر تھی۔ ایک ہاتھ پر غنی بھی کدوایا تھا، پورا مٹا تو نہیں تھا لیکن نشان باقی تھا۔ یہ تھا عبدالغنی جسے سب محبت کرتے تھے۔ اگلے روز اخبار میں خبر چھپی کہ نامعلوم افراد نے ٹانک روڈ پر چار بندوں کو قتل کیا ہے مگر ہمیں تو معلوم تھا کہ وہ نامعلوم کون تھے شاید اس ملک میں ہر کسی کو معلوم ہے کہ نامعلوم کے بھیس میں یہ معلوم کون ہیں مگر کوئی نام نہیں لے سکتا تھا آج ہماری تحریک نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہم نے ان نامعلوم قاتلوں اور اغواکاروں کو نام دے دیا ہے جس کے پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ اخبار کے اس خبر میں ان کی تصویریں بھی دی گئی تھی۔ بہت ہی بری طریقے سے مارا تھا وہ بھی چہروں پر اور میں نے صندوق

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں پڑے ہوئے عبدالغنی کی لاش کو بھی دیکھا اور اخبار کی تصویر بھی اور میں دونوں جگہ اس سے پہچاننے میں ناکام رہا۔

عبدالغنی بھی ان ہزاروں پشتونوں کی صف میں کھڑا ہو گیا جنہیں ماورائے عدالت قتل کر دیا گیا تھا۔ اس نے وہ کون سا گناہ کیا تھا یا ایسی کونسی ریاست مخالف سرگرمی کا حصہ بنا تھا اس کا ہمیں کبھی پتہ نہ چل سکا اگر پتہ تھا تو صرف یہ کہ ایک اور پشتون فیئر ٹرائل اور وکیل اور دفاع کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس کو اس کی زندگی اور آزادی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جب عبدالغنی کی لاش گھر لائی گئی تو ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا، ہر طرف آہوں اور سسکیوں کی آوازیں تھیں مگر دو چہرے بڑے خوش تھے وہ عبدالغنی کے ماں باپ کے چہرے تھے۔ ان کی اولاد بلا آخر گھر آ گئی تھی بلکہ میں نے عبدالغنی کے والد کا چہرہ اس سے پہلے کبھی زندگی میں اتنا ہشاش بشاش نہیں دیکھا تھا، تین سال اس نے کس جہنم میں گزارے تھے یہ تو صرف اس کو معلوم تھا۔ آخر کار اس کا انتظار ختم ہوا تھا اب اس کا بیٹا ظالموں کی چنگل سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا تھا اب اس کو کسی عامل کے دھوکے میں نہیں آنا تھا، کسی گوڈ طالبان کے در پر نا وتیے اور پیسے لے کر نہیں جانا تھا، تمام وسوسے اور تکلیف دیتی امیدیں ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئی تھی۔ اب اسے ہر نئے بندے کو ملاقات کے لیے آتے دیکھ کر ڈر محسوس نہیں ہوتا ہو گا۔ اب کسی کے سامنے گڑگڑانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ عبدالغنی کو منوں مٹی تلے دفنا کر واپس آ گئے جب گھر واپس آ رہے تھے تو نہ جانے کیسے کیسے خیالات دل میں آ رہے تھے میرے والد صاحب کبھی کبھی کہتے ہیں کہ کسی کو غائب کر دینا یا ماورائے عدالت قتل کر دینا آرمی کو بہت آسان لگتا ہے لیکن وہ اس بات کا دھیان نہیں کر پاتے کہ اس عمل سے صرف وہی ایک زندگی متاثر نہیں ہوتی بلکہ سینکڑوں زندگیاں متاثر ہوتی ہیں، خاندان رشتہ دار دوست احباب سب متاثر ہوتے ہیں اور ایسے جذبات ان کے دل میں موجزن ہو جاتے ہیں کہ شاید پھر اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ عبدالغنی کی موت ہی وہ فیکٹر تھا اگرچہ پہلا نہیں تھا کہ دل نے کہا کہ بس بہت ہو گیا کب تک ہم چھپ یوں ہی اٹھائے جاتے رہیں گے اور ماورائے عدالت قتل ہوتے رہیں گے۔ آخر انسان

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہیں ہم کچھ تو کرنا چاہیے اور پھر سوال یہ تھا کہ کس طرح اور کیسے، یعنی ایک ایسی تنظیم ہونی چاہیے جو اس معاملے پر آواز اٹھائے اور جس کی آواز قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر سنی جائے۔ لاپتہ افراد کے لئے ایک آمنہ جنجوعہ کی سربراہی میں ایک تنظیم بنائی گئی تھی مگر اس کا پریشر ریاست کچھ خاص نہیں لیتی۔ اس کے لیے ایک ایسی تنظیم چاہیے تھی جو پوری قوم کو اٹھا سکے اور ان کو یہ باور کرا سکے کہ یہ مسئلہ اجتماعی ہے اور یہ ہم میں سے کئی خاندانوں پر گزر گیا ہے جبکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس طرح تو ہم ریاست کو کھلی چھوٹ دے رہے ہیں کہ وہ ہمارے بنیادی انسانی حقوق کو پامال کرتی رہے اور جو کرنا چاہے وہ آسانی سے کر سکے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں اور باقی دنیا پر بھی باور کرانا ہوگا کہ یہ ہم دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت گردی کا شکار ہیں۔ دہشت گرد تو یہ ہیں جنہوں نے دہشتگرد خود بنائے جبکہ پروفائلنگ پوری دنیا میں پشتونوں کی کی۔ پشتون تحفظ موومنٹ سے پہلے تنظیم مقامی سطح پر آنے والے مسائل خصوصی طور پر لینڈ مائینز کے مسلے پر منظور پشتون نے محسود تحفظ مومنٹ بنائی جس نے نہ صرف اس مسلے پر کامیابی سے کام کیا بلکہ کئی لینڈ مائینز وکٹمز سمیت 2017 میں جنگ سے متاثرہ آئی ڈی پیز کی بھی مالی مدد کی۔ لیکن ہم نے لاپتہ افراد کا مسلئہ کیسے محسود تحفظ مومنٹ کا حصہ بنایا اسکے بارے میں میں اگلے باب میں لکھوں گا

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

لاپتہ افراد کا معاملہ کب اور کیسے
(ایم ٹی ایم) کے ڈیمانڈ میں شامل کیا گیا

ایم ٹی ایم اگرچہ بہت سارے ایسے ایشوز کو اجاگر کر چکی تھی کہ جو اپنے اندر یہ کیپیسٹی رکھتی تھی کہ یہ ایک نہ ایک دن پورے پشتون قوم کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ یہ تنظیم "گانڑخط" جو کہ پشتون روایتی لباس ہے اس کی پاک فوج کے جوانوں کی طرف سے بے حرمتی پر بھی ڈیرہ اسماعیل خان میں پوری پشتون قوم کو اکٹھا کر چکی تھی۔ لاپتہ افراد کا معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنا ایک مسئلہ تھا اس میں مشر منظور پشتین کی رائے یہ تھی کہ چونکہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم آواز اٹھائیں اور پھر فیملی کو ڈرا دھمکا کر پیچھے کر دیا جائے تو اس میں ہم سب کو بہت نقصان ہو گا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی لئے فیصلہ یہ ہوا کہ اگر فیملی ساتھ کھڑی ہوتی ہے تو ہم اسکے لئے آواز اٹھائیں گے۔ ہمارے ساتھ ایم ٹی ایم میں جاوید محسود بھی ہوتے تھے اور یہ واحد ایک ایسے بندے تھے جو ہم میں سے عمر میں سب سے بڑے تھے۔ اس کا ایک کزن جو کہ خصادار فورس کا اہلکار بھی ہے، کی فوج کے ساتھ تو تو میں میں ہوئی تھی اس بنا پر بم دھماکے کا الزام لگا کر حبس بے جا میں رکھا تھا۔ جاوید محسود نے خود ہی اپنے کزن طاہر عرف طور خان کو فوج کے حوالے کیا تھا اور اسے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ بس ایک ہفتے بعد اسکو چھوڑ دیں گے۔ مگر جس طرح فوج روایتی جھوٹ بولتی ہے، طور خان کو کئی مہینے ہو گئے مگر نہ چھوڑا گیا اور نہ ہی ملاقات کروائی جاتی تھی۔ طور خان کو ٹانک پولیٹیکل کمپاؤنڈ جانے والے سبھی لوگ جانتے تھے۔ اپنی فرض شناسی پر مشہور تھا۔ ایک دفعہ اس کو آرڈر دیا گیا تھا کہ کسی گاڑی کو کمپاؤنڈ کے اندر نہیں آنے دینا۔ اتفاق سے فوج کے کرنل کی گاڑی آئی تو اس نے اندر نہیں چھوڑا۔ کرنل نے پہلے ڈرانے دھمکانے سے کام چلانے کی کوشش کی مگر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے آرڈر ہے کہ کسی گاڑی کو اندر نہیں چھوڑنا، اب آپ کرنل ہے یا جنرل، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مگر آپ گاڑی اندر نہیں لے کر جا سکتے۔ تب اندر موجود پولیٹیکل ایجنٹ سے رابطہ کیا گیا اور وہ خود بھاگتا ہوا باہر آیا، کہتے ہیں کہ اسی کرنل نے اس کو فرض

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

شناسی پر شاباش بھی دی تھی۔ لیکن یہ چیز اس کے گلے بھی پڑی۔ بعد میں کسی ناصر نامی میجر نے اسے دھمکی بھی دی تھی اور اس کے طور خان کو اسکے حوالے کیا گیا تھا۔ دھماکے والا واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ جہاں دھماکہ ہوا تھا وہاں سے پہلے ان کی گاڑی گزری تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی اہلکار تھے جن کی وہاں ڈیوٹی تھی اب اگر یہ بم اس نے لگایا تھا تو ظاہر سی بات ہے پھر اکیلے تو نہیں لگایا ہوگا مگر بات صرف اس کے گلے میں فٹ کی گئی۔ جاوید کو خوف تھا کہ کہیں طور خان کو نقصان نہ پہنچے اسلئے اس سے ہر در پر دستک دی مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ خود پولیٹیکل انتظامیہ جن کا طور خان اہلکار تھا، وہ بھی چھپ کھڑی تھی۔ بالآخر جاوید محسود نے احتجاج کا اعلان کیا ہم نے اسکی تائید کی۔ سوشل میڈیا پر بھی کمپین شروع کر دیا مگر احتجاج کرنے کا موقع نہیں ملا اور طور خان کو چھوڑ دیا گیا۔ اس کی بھی داڑھی اور مونچھوں کا برا حال تھا۔ جاوید محسود نے طاہر عرف طور خان کی رہائی کا کریڈٹ ایم ٹی ایم کو دیا۔ اس طرح ایک اور کیس سعید اللہ کا آیا۔ وہ پیشے سے ڈرائیور تھا، ٹانک اور وزیرستان کے بیچ گاڑی چلاتا تھا۔ اس کی گاڑی بھی چھینی گئی اور اس کو بھی غائب کر دیا گیا۔ اس کے لیے ہم نے سوشل میڈیا پر آواز اٹھائی۔ انٹیلی جنس اداروں کو اور بلخصوص گڈ طالبان جنہوں نے اسے اٹھایا تھا، کو یہ بہت برا لگا تھا کہ ہم نے یہ (سعید کو رہا کرو) لکھا تھا کہ گویا یہ انہیں حکم دینا تھا۔ اس کے بھائی کو بھی جو ہمارے پاس آیا تھا، دھمکی دی گئی تھی کہ اگر ان لڑکوں سے آئندہ ملے تو اپنے بھائی کی لاش لے جانا اور اس کا بھائی ڈر گیا، اور وہ ہم سے پیچھے ہو گیا۔ ہمارے اوپر زیادہ پریشر آگیا یعنی وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اس پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ ہمیں ایک اصولی مؤقف اپنانا چاہیے کہ اغوا کر کے غائب کرنا غیر آئینی اقدام ہے اور اس کو سزا دینا اور چھوڑنا کورٹ کا کام ہے۔ ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہر لاپتہ فرد کو کورٹ میں پیش کیا جائے اور جو آئین و قانون کہتا ہے اسکے مطابق عمل ہونا چاہئے۔ سعید اللہ کے معاملے میں بعد میں ہم دوستوں پر پریشر ڈالا گیا کہ ہم اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹ سے اس کا پوسٹ ڈیلیٹ کر دیں مگر ہم اصولی موقف پر قائم رہے، سعید اللہ کو چند مہینوں بعد رہا کر دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

دسمبر 2017 میں ہم یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ چونکہ ہمارے مسائل یہاں پر حل نہیں ہونے والے اور ہم نے اس حوالے سے بہت ساری میٹنگز بھی کر لی تھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اس سال یعنی 2017 کے آخر میں یا 2018 کے شروع میں ہی اسلام آباد میں جاکر دھرنا دیں گے لیکن ہم میں سے کسی ساتھی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ 2018 سال پشتون قوم پر مسلط اس جنگ میں بے تحاشا نقصان اٹھانے کے بعد اتنا انقلاب انگیز ہوگا۔ 5 جنوری 2018 کا دن تھا کہ ہماری میٹنگ ہو رہی تھی کہ اسلام آباد دھرنا کیسے دیا جائے۔ اس میں ہمارے اس وقت ایک ایم ٹی ایم کے ساتھی نور رحمان نے کہا کہ میرا ایک رشتہ دار نقیب اللہ کراچی سے اٹھایا گیا ہے۔ تین دن ہو رہے ہیں کوئی پتہ نہیں چل رہا۔ جب پوچھا کہ یہ بندہ کیسا تھا تو اس نے اس کی تصویریں دکھائیں۔ میں نے کہا یہ تو کوئی ماڈل لگتا ہے۔ کیا ماڈلنگ بھی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں مگر شوق اس کا بہت تھا۔ ہم نے اسے کہا کہ اس کی فیملی لے آؤ تاکہ ہمارے پاس ثبوت ہو اور اس کے لیے سوشل میڈیا پر کمپین شروع کر دینگے۔ اس نے کہا کہ اس کی فیملی وزیرستان میں ہے اور وہ سارے ڈر رہے ہیں، کراچی میں اس کا چاچا بھی کراچی چھوڑ کر آگیا ہے۔ تب ہمیں یہ خدشہ ہوا کہ اگر کمپین کرتے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ وہ ظالم کوئی نقصان پہنچا دے اور پھر نقیب اللہ کی فیملی ہمارے گلے پڑے کہ جب ہم خود کچھ نہیں کر رہے تھے تو تم لوگوں کو کیا ضرورت تھی کچھ کرنے کی۔ ہم نے اسے کہا کہ کسی طرح اس کی فیملی کو منالو اور سامنے لے آو۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے تو شاید حالات کچھ اور ہو سکتے تھے۔ پھر میری شروع دن سے ہی جب سے ہم نے لاپتہ افراد کے کیسوں پر کام شروع کیا ہے، یہ کوشش ہوتی تھی کہ ہر لاپتہ فرد کیلئے علیحدہ سے وہ ممکنات بھی سوچو کہ جس سے اس لاپتہ فرد کے لئے کچھ ہو سکتا ہو۔ نقیب شہید کے لئے میں نے سوچا کہ جب تک اس کی فیملی خود سامنے نہیں آجاتی تب تک میں کوئی ایسا شخص ڈھونڈو جو اس کی رہائی میں کوئی کردار ادا کر سکے۔ میری سوئی شیر علی خان محسود پر جاکر رو کی۔ یہ سابق ایم این اے مرحوم سخی جان محسود کا فرزند ہے اور آج کے دو ایم اینز سیف عالمگیر محسود اس الرحمان اور کے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اب میں حیران ہوتا ہوں کہ میں نے نقیب اللہ کی رہائی کیلیے مدد بھی ایسے خاندان سے مانگی جس نے بعد میں نہ صرف نقیب شہید کیلئے فوکل پرسن کا کردار ادا کیا بلکہ نقیب اللہ کے ہم قبیلہ اور ہم گاؤں بھی نکلے جبکہ میں نے جب شیر علی خان کو اس کا بتایا تھا تو اس نے نہ صاف اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اسے ٹھیک طریقے سے جانتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ جتنی میں نے تحقیق کی ہے۔ یہ لڑکا بالکل ٹھیک ٹھاک نکلا ہے۔ ایسی ویسی کسی سرگرمی میں ملوث نہیں رہا۔ اس نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے کنٹیکٹس کو استعمال کروں لیکن تم پھر بھی صحیح طریقے سے تحقیق کر لینا، ایسا نہ ہو کہ میرے گلے پڑ جائے۔ اب خدا جانے اس نے کسی سے رابطہ کیا ہو گا یا نہیں مگر کم از کم اس خاندان تک میں نے نقیب شہید کی اغوائیگی کی خبر اس کی شہادت سے پہلے دے دی تھی۔ جس پر بعد میں جب یہ کیس انٹرنیشنل شہرت اختیار کر گیا تو یہ خاندان سب سے آگے رہا۔ لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ہم کسی کی نیت نہیں جان سکتے چاہے انہوں نے نقیب شہید کی شہادت سے پہلے کردار ادا کیا ہو یا بعد میں، انہوں نے کردار ادا کیا، میرے لیے یہ بہت کافی ہے۔ نقیب شہید کو تین جنوری کو اٹھایا گیا تھا اور تیرہ جنوری کو جعلی مقابلے میں شہید کر دیا گیا تھا۔ 13 جنوری تک زیادہ تو نہیں لیکن کئی ایک لوگوں نے سوشل میڈیا پر پوسٹ کیئے، پھر 14 جنوری 2018 کو فیس بک پر آئی ایس آئی نامی ایک پیج نے اس مقابلے کی تصویریں شیئر کی. اس طرح ایک نوجوان ہمیں نقیب شہید جیسے لگا جس کا اگلے روز 15 جنوری کو مکمل تصدیق ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا سوشل میڈیا پر ہر جگہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کوئی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

لاپتہ افراد کے بارے میں ہم کیمپین 2017 میں ہی شروع کر چکے تھے۔ اس کے لئے میں نے ایک آزاد نظم بھی لکھی تھی کہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

"میں مجرم اعظم ہوں
اور میرا جرم یہ ہے کہ میں اٹھایا گیا ہوں
اور میرے ماں باپ کا تعلق ایک ایسے خطے سے ہے
جس کا نام پاکستان ہے
اور یہ جرم اتنا بڑا ہے
کہ نہ مجھے عدالت تک رسائی حاصل ہے
اور نہ ہی وکیل کرنے کا حق ہے

اب وہ سوچ کہ لاپتہ افراد کے لیے پوری قوم جب تک نہیں اٹھے گی تب تک صرف متاثرہ خاندان سے دال نہیں گلے گی۔ نقیب شہید نے یہ تمام لوازمات پورے کر دیئے تھے ہماری تحریک نے اگرچہ 2017 کے اواخر میں لاپتہ افراد کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنایا اور ہم 30 دسمبر 2017 تک اسلام آباد میں دھرنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے لیکن قدرت نے شاید بہت بڑا کام لینا تھا اسی لیے تاریخ کچھ وجوہات پر ڈیلے کر دی گئی تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اداروں کی طرف سے بار بار یہ کہا جا رہا تھا کہ ہمیں وقت دیا جائے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے اوپر بوبڑ، کڑاشتی اور شکتوئی جنوبی وزیرستان سے نئے آنے والے آئی ڈی پیز کا بوجھ پڑ گیا تھا جس کے لیے ہم ان کی مدد کر رہے تھے۔ اس وقت جنوبی وزیرستان کے ان تین گاؤں سے آرمی نے لوگوں کو نکالا تھا اور پھر بکا خیل کیمپ میں رکھا تھا۔ اس کے لیے نہ صرف میں اور منظور پشتین اور علاؤالدین بکا خیل کیمپ گئے تھے بلکہ سخت احتجاج کی کال دی تھی کہ ان لوگوں کو نکالنے کے لیے کیا ضرورت تھی جب ایک دفعہ آپریشن راہِ نجات میں یہ لوگ نقل مکانی کر کے واپس آرمی کی اجازت سے گئے تھے۔ اب انکو دوبارہ نکالا جانا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ شاید وہاں غیر ریاستی عناصر کو بسانے کا پروگرام تھا۔ ہم نے جب بکا خیل کیمپ کا دورہ کیا اور وہاں لوگوں کے حالات دیکھے تو فیصلہ کیا کہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

انکو یہاں سے نکالنا ضروری ہے اسلئے احتجاج کی کال دی۔ بکاخیل کیمپ سے لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی مگر مسلہ یہ ہوا کہ (ایف ڈی ایم اے) نہ توان کوراشن دینے کو تیار تھی اور نہ ہی متاثرین ماننے کو تیار تھی۔ ہم نے اپنے ہم قوم بھائیوں سے ان کے لیے چندہ کیاان کے لئے راشن پہنچاتے رہے۔ یہ دوایسے وجوہات تھیں جس کی بناپر ہمارے دسمبر 2017 کا دھرنا تاخیر کا شکار ہو گیا تھا لیکن 2018 میں نقیب شہید نے میدان اور زیادہ ہموار اور زمین نرم کر دی تھی۔ اب اس نادر موقع سے پوری قوم کیلیئے اور خاص کر مظلوموں کیلیئے بڑا قدم اٹھانا تھا چونکہ ہم دھرنے کا اعلان تو 2017 میں کر چکے تھے اس لئے فیصلہ ہوا کہ ہم سب 26 جنوری 2018 کو پیدل مارچ ڈی آئی خان سے براستہ لکی مروت، بنوں، کوہاٹ، درہ ادم خیل، پشاور اور وہاں سے مردان اور صوابی اور پھر بڑے قافلے کی صورت میں اسلام آباد جائینگے۔ میں ذاتی طور پر پیدل مارچ کا حامی نہیں تھا کیونکہ یہ بہت ہی خطرناک کام تھا 26 جنوری کو جب منظور پشتین دو درجن ساتھیوں کا مختصر حسینی قافلہ لے کر نکلا تو یہ سر کی بازی تھی۔ سیکورٹی ایجنسیز کو آگ لگی ہوئی تھی، کوہاٹ میں مشر منظور اور اس کے ساتھیوں کو ملاقات کے لیے بلایا گیا جہاں اسے صاف صاف کہا گیا تھا کہ اگر وہ یہاں سے واپس نہ لوٹے تو پھر جب اسلام آباد سے واپسی ہو گی تو تم سب کے لئے چھری تیار رکھی ہو گی۔ جس طرح اس قافلے کا ہر جگہ استقبال ہو رہا تھا اور لوگ مل رہے تھے اور اس سے سیکورٹی ایجنسیوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ اس طرح اسلام آباد دھرنا بھی ہوا اور وہ خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوا کہ ایک دن لاپتہ افراد کی بات کرنا شجر ممنوعہ نہیں رہے گا، روز روز کا مرنا ختم ہو جائے گا، اور پوری قوم یکجا ہو کر انتہائی ظالمانہ فعل کے خلاف مزاحمت کریگی۔ اور پھر چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھا کہ جب جب سیکورٹی اداروں نے بندے اٹھائے تو پورے علاقے والے اپنے گھروں سے نکل کر سراپا احتجاج ہو گئے۔ تحریک نے مجھے بعد میں یہ ذمہ داری تفویض کر دی کہ لاپتہ افراد کا ڈیٹا اکٹھا اور ترتیب کروں۔ یہ ڈیٹا اداروں کے ساتھ بھی شئیر ہوا، بہت سارے لوگ تحریک کی وجہ سے گھر واپس بھی آ گئے مگر بہت ابھی بھی لاپتہ ہیں۔ بعد میں آئی ایس پی آر نے کہا کہ ہر لاپتہ فرد کو ریاست

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے ساتھ نہ جوڑا جائے اور یہ کہ بہت سارے جنگ کے دوران مارے گئے ہوں گے مگر مجھے جو لاپتہ افراد کے لیے کام کرتے ہوئے تجربہ اور معلومات حاصل ہوئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ کئی لوگ ان سے انٹرمنٹ سنٹرز میں قتل ہو گئے ہیں بلکہ یہی نہیں جو آئی ایس پی آر نے دعوی کیا تھا کہ جو لوگ ہمارے پاس ہیں وہ ایک باقاعدہ قانونی طریقہ کار کے تحت ہیں مگر اس میں بھی حقیقت یہ تھی کہ جب ان کو لگا کہ یہ مسئلہ تو بالکل ہی ہمارے گلے کا ہار بن رہا ہے تو انہوں نے دھڑا دھڑ ملٹری کورٹس کے ذریعے سزائے موت کی سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ اس حوالے سے صرف ایک کیس بیان کر کے اس باب کو ختم کروں گا۔ 2018 کے وسط میں اور اس کے بعد ملٹری کورٹ نے لاپتہ افراد کو سزائے موت کی سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ ایک ایک مہینے میں تین تین فیصلے آنے لگے۔ یہ سزا پانے والے تقریباً پشتون تھے انہوں نے ہم سے بھی رابطہ کیا۔ میرے پاس سلمان بہادر کے والد آئے جس کو غالباً 13 جولائی 2018 کو چودہ اور لوگوں سمیت سزائے موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ سلمان بہادر کے والد نے میرے سامنے پوری فائل کھول دی اور جو میں نے دیکھا وہ حیران کر دینے والا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ 2014 میں جانی خیل ایف آر بنوں میں دھماکا ہوا تھا جس میں ایک فوجی شہید اور تین زخمی ہوئے تھے۔ دھماکے کی ایف آئی آر کوئی 22 نامزد ملزمان کے خلاف، وہاں تعینات آرمی کی کشمیر یونٹ کے میجر فیصل کی مدیت میں درج کی گئی تھی۔ ان نامزد ملزمان میں ایک سلمان بہادر بھی شامل تھا۔ سلمان بہادر کی فیملی کی خاندانی دشمنی تھی، اس کو جب معلوم پڑا تو فوراً متعلقہ آرمی یونٹ سے رابطہ کیا گیا کہ اس بندے کو ایف آئی آر میں کیسے اور کس کے کہنے پر ڈالا گیا ہے؟ آرمی نے دوبارہ تحقیقات شروع کی۔ اس حوالے سے ایک جے آئی ٹی ٹیم بھی بنی اور اس نے بھی اپنی تحقیقات کیں اور معلوم پڑا کہ غلطی سے یہ نام ڈالا گیا ہے۔ آرمی کی کشمیر یونٹ کی طرف سے باقاعدہ نوٹیفیکیشن جے آئی ٹی کو دیا گیا اور استدعا کی گئی کہ ایف آئی آر سے سلمان بہادر کا نام ہٹایا جائے۔ جے آئی ٹی نے بھی اپنی فائنڈنگز میں سلمان بہادر کو بے قصور مانا اور ایف آئی آر سے اس کا نام ہٹا دیا گیا مگر 2015 میں سلمان بہادر کو اٹھا لیا جاتا ہے اور لاپتہ کر دیا جاتا ہے بالآخر

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

13 جولائی 2018 کو ٹی وی کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ سلمان بہادر کو 13 دیگر بندوں سمت سزائے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ جب (ائی ایس پی آر) کی ویب سائٹ سے پریس ریلیز کو دیکھا گیا تو معلوم پڑا کہ اسی دھماکے کے جرم میں سزا دی گئی تھی جو 2014 میں جانی خیل میں ہوئی تھی جس میں ایک اہلکار شہید ہوا تھا جس میں خود آرمی نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اسند عا کی تھی اور جے آئی ٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں اسے بے قصور مان کر نام ایف آئی آر سے خارج کیا تھا اور یہ سب کچھ صرف اپنے سر سے لاپتہ افراد کا الزام مٹانے کے لئے اور یہ دعویٰ کرنے کے لیے کہ جو لوگ ہمارے پاس ہیں وہ تو ایک قانونی طریقہ کار کے تحت ہیں اور اس بنیاد پر سزا و جزا دی گئی ہے۔ بحالانکہ جب ہم نے 74 ایسے ملٹری کورٹ سے سزا یافتہ لوگوں کا کیس پشاور ہائیکورٹ میں چیلنج کیا جس میں سلمان بہادر کا کیس بھی تھا تو پشاور ہائی کورٹ نے ایک تاریخ ساز فیصلہ دیا اور ملٹری کورٹس کے بے تحاشہ خامیوں اور فیئر ٹرائل اور انصاف کا خون کرنے والے فیصلوں کو غلط قرار دیا اور سب کو رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ مگر وفاقی حکومت نے اس فیصلے پر سپریم کورٹ میں سٹے آرڈر لے لیا۔ اب جب آرمی کو کوئی دوسرا راستہ نہ ملا تو ہم ہی کو اٹھا کر جیلوں میں ڈال دیا۔

اگست 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی سیکورٹی 8

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میری رفتاری،

ائی ایس ائی کا غیر قانونی ڈیمانڈ اور تشدد

جنوری 20 ء2019 کو کراچی میں نقیب شہید کی برسی اعلان کی گئی تھی۔ ڈی آئی خان سے ہم پانچ ساتھی جلسے کے لئے چند دن پہلے گئے، کیمپین میں بھی حصہ لیا، 20 تاریخ کو جلسہ منعقد ہوا ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مجھ پر ایف آئی آر اسی جلسے میں تقریر کرنے کا کٹا تھا اور پھر اسی وجہ سے مجھے گرفتار کیا گیا تھا اسلئے پہلے اپنے تقریر کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "نقیب اللہؒ کی شہادت کو ایک سال مکمل ہو چکا ہے اور تمام ثبوتوں اور پولیس کی تفتیشی رپورٹوں کے مطابق راؤانوار مجرم ثابت ہو رہا ہے بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ صرف اسے ضمانت ملی ہے بلکہ اب تک جیل کی ہوا تک نہیں کھائی"۔ (اتفاق دیکھئے کہ میرا کیس بھی اسی عدالت اور جج کے پاس ہے جس نے راؤانوار کو ضمانت دی مگر میری ضمانت منسوخ کر دی) میں نے تقریر میں کہا کہ "مجھے فکر ہے کہ جو اس ملک میں 70 ہزار سے زائد پشتونوں کو قتل کیا گیا ہے اس کا حساب کیسے دیا جائے گا جب ایک نقیب کو انصاف نہیں مل رہا۔ میں نے لوگوں کو مبارکباد دی کہ ان کی مزاحمت نے بیلگام اداروں کو قانون کی طرف واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جنرل باجوہ کو بھی مخاطب کیا کہ آپ کے بیٹے کی حال ہی میں شادی ہوئی اور آپ بہت خوش تھے یقیناً خوشی کا موقع تھا لیکن کبھی سوچا ہے کہ اگر آپ کا بیٹا لاپتہ کر دیا جائے تو آپ پر کیا گزرے گی کہ جب اپنی بہو کو بیوہ نہ ہوتے ہوئے بھی بیوہ دیکھو گے یا اپنے پوتے پوتیوں کو یتیم نہ ہوتے ہوئے بھی یتیم دیکھو گے تو کیا آپ کا کلیجہ نہیں پھٹے گا۔ جنرل باجوا صاحب! یہاں ہزاروں بہنیں آدھی بیوہ بن کر بیٹھی ہیں۔ بوڑھے ماں باپ کی بال سفید ہو گئے اور آنکھوں کی بینائی چلی گئی اپنے لاپتہ جگر گوشوں کی راہ تکتے تکتے۔ میں نے ایک واقعے کا ذکر بھی کیا کہ ایک ماں جو بستر مرگ پر پڑی تھی اور اپنے لاپتہ بیٹے کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی وہ مر گئی مگر اپنے بیٹے کو دیکھ نہ سکیں کیونکہ آپ کے ہاں انصاف اور

Scanned with CamScanner

انسانیت صرف ریمنڈ ڈیوس اور کلبوشن یادیو کے لئے ہیں (ابھی نندن کے واقعے کے دوران میں
جیل میں تھا
پھر میں نے ایک کتاب کا حوالہ دیا کہ کس طرح پشتونوں کو اس ریاستی اداروں نے پوری دنیا میں بد نام کیا۔ جنرل شاہد عزیز کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" میں وہ کہتا ہے کہ جب جنرل پرویز مشرف نے کارگل میں فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جنگ چھڑ گئی تو ہم نے مشرف سے کہا کہ اگر انٹرنیشنل دباؤ آیا تو کیا کریں گے تو اس نے کہا کہ میں نے جو فوجی بھیجے ہیں، اس کو یہ ہدایت دی ہے کہ ایک دوسرے سے پشتو میں بات کیا کریں۔ اس سے ہم یہ ثابت کریں گے کہ یہ ہمارے فوجی نہیں بلکہ مجاہدین ہیں یعنی مجاہدین اور ان ہی کے اصطلاح میں "دہشت گرد" صرف پشتو بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ریاست کی طرف سے ہم پر لگائی گئی اس تہمت کو مٹائیں اور حقیقت دنیا کے سامنے آشکار کردیں"۔ اس کی بنیاد پر کیس بنایا گیا مگر حقیقت حال یہ تھی جو انہوں نے میرے ساتھ کیا، یا تو مجھے قتل کرنا چاہتے تھے یا پھر گرفتاری کے بعد آئی ایس آئی نے جو مطالبہ رکھا اسکو پورا کرنا چاہتے تھے جس کا آگے میں ذکر کرونگا۔ جلسہ جب ختم ہوا تو رات کو ہم پر ایک پولیس پارٹی نے حملہ کردیا جس کی لائیو ویڈیو بنائی۔ تب انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا کیونکہ ظاہر ہے تب تک انہوں نے مقدمہ درج نہیں کیا تھا۔ اگلے روز ہم نے دوپہر 3 بجے کے لئے بس کے ٹکٹ لیے۔ ساتھیوں نے کہا کہ جب تک ٹائم ہے تو سمندر کے کنارے سیر کے لیے چلے جاتے ہیں بعد میں چند دوستوں نے کہا تھا کہ عالم زیب کو وہاں نہیں لے کر جانا چاہیے تھا لیکن میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے نقصان پہنچانے یا گرفتار کرنے کا انکا ویسے بھی ارادہ تھا اگر میں کراچی میں گرفتار نہ ہوتا تو ڈیرہ اسماعیل خان واپسی پر ہم کو کہیں بھی اتارا جاتا تب میرے ساتھ میرے ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچاتے۔ سمندر کنارے سے واپس ہونے لگے تو روڈ پر دیکھا کہ پولیس موبائل اور سیول گاڑیاں جمع ہورہی تھی۔ اندازہ تو ہوا کہ کچھ نہ کچھ تو یہ ضرور کریں گے۔ اپنا سیل فون دیکھا تو چار جنگ بھی کم تھی لیکن اتنی تھی کہ تھوڑے وقفے کے لئے لائیو آ

(c) ketabton.com: The Digital Library

سکوں، تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ انہوں نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور آگے جا کر ہمارا راستہ بلاک کر دیا۔ میں نے تو فیس بک لائیو آن کر دی۔ پھر جو ہوا لاکھوں لوگوں نے دیکھا۔ ہم پہ بندوقیں تانی ہوئی تھیں۔ شاید ان کو اندازہ ہو گیا کہ فیس بک پر لائیو آرہے ہیں اسی لیے جو کرائم سین انہوں نے کرنا تھا وہ نہیں کر پائے۔ ہم دو گاڑیوں میں تھے۔ پولیس اور سادہ کپڑوں میں ملبوس بندوں کے ساتھ ہماری دھکم پیل شروع ہو گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ مجھے گرفتار کیے بنا نہیں جائیں گے۔ اگر ہم وہاں سے زبردستی نکل بھی جاتے تو سہراب گھوٹ تک پہنچتے پہنچتے ان کا پورا لشکر ہمارے پیچھے ہوتا تب میرے ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچاتے مجھے ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکار نے کان میں آکر پشتو میں کہا کہ آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہو گا۔ میں فوراً روانہ ہو گیا اور جا کر موبائل میں بیٹھ گیا اور اپنا فون بند کر دیا۔ ہمارے ایک ساتھی قاضی طاہر نے آکر کہا کہ اترآؤ لیکن میں نے کہا کہ چھوڑ دو ان کو۔ انہیں لازماً مجھے لے کر جانا ہے۔ میرے ایک اور ساتھی شیر اللہ نے انھیں کہا کہ اگر ان کو لے جانا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے کر جاؤ اور زبردستی پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ پولیس والوں نے موبائل دوڑا دی۔ کوئی ایک کلومیٹر دور گئے ہونگے کہ یکدم گاڑی روک دی اور شیر اللہ کو زبردستی نیچے اتارا اور پولیس والے نے کلاشنکوف کا بولٹ مارا اور شیر اللہ پر تان لیا۔ شیر اللہ نے بھی اپنا گریبان چاک کر کے کہا کہ اگر مرد کے بچے ہوں تو یہاں مارو۔ پولیس موبائل میں ایک دفعہ پھر سے پولیس والوں کے ساتھ ہماری کشتی شروع ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر موبائل بھگائی گئی۔ راستے میں مجھ سے کہا گیا کہ ہمیں تمہاری آنکھیں پر پٹی اور ہاتھوں کو زنجیروں سے باندھنا ہو گا۔ میں نے کہا کہ جب میں آپ کے ساتھ آرام کے ساتھ جا رہا ہوں تو مزید مجھے مجبور مت کریں مگر انہوں نے کہا کہ ہم مجبور ہیں۔ ایک دفعہ پھر سے موبائل میں دھکم پہل شروع ہو گی۔ بالآخر مجھ پر قابو پا لیا گیا اور ہاتھ زنجیروں سے پیچھے کی طرف خوب کس کر باندھ لئے گئے اور آنکھوں پر پٹی دے دی گئی۔ میں نے بھی نعرے لگانا شروع کر دیئے کہ "یہ جو دہشت گردی ہے اس کے پیچھے وردی ہے" گاڑی چلتی رہی اور کافی چلی۔۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے دوسری گاڑی میں ڈال دیا ہے اور پھر گاڑی کافی چلی۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

بارش بھی ہونے لگی بالآخر ایک جگہ پہنچا دیا گیا۔ میرے ہاتھوں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی مجھے اتار کر ایک جگہ بیٹھا دیا گیا۔ میں لوگوں کو اپنے آس پاس محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے اسے آواز دی کہ میرے ہاتھ پیچھے کی طرف سے کھولے جائیں مگر کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد وہی اہلکار پھر سے آیا۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ میں پھر آؤں گا مگر وہ پھر کبھی نہ آیا کیونکے جب میں نے آئی ایس آئی کا مطالبہ نہیں مانا تو مجھ پر کیس ڈالا گیا۔ اس نے مجھ سے زنجیر ہٹا دی اور ہاتھ آگے کی طرف ہتھکڑی سے باندھ دیئے۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے جسم میں خون کی روانی شروع ہو گئی ہو مگر آنکھوں پر بدستور پٹی قائم رہی۔ پھر مجھے وہی بٹھایا گیا کوئی شام کا وقت ہونے والا تھا یعنی میرے اس حالت میں کوئی دو تین گھنٹے ہو رہے تھے مجھے اٹھا کر دوسرے کمرے میں پانی پر سے گزار کر لے جایا گیا مجھے ایسا لگا کہ جیسے حوالات تھا، اندر دو بندے اور بھی تھے جن سے میں نے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان میں ایک عابد آفریدی تھے جو ایک کیس میں لائے گئے تھا۔ بعد میں مجھے بتایا کہ پولیس والوں نے کہا تھا کہ خبردار جو اس کے ساتھ بات کی۔ زنجیروں کی تکلیف اور مسلسل سفر سے میں اتنا تھک گیا تھا کہ جیسے ہی اسی حالت میں لیٹ گیا تو نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ رات کے شاید دس بجے حوالات کا دروازہ کھلا۔ میری انکھ کھلی تو دو سادہ کپڑوں میں ملبوس بندوں کو حوالات میں آتے دیکھا، میری نیند کے دوران آنکھوں سے پٹی ہٹ گئی تھی تو انہوں نے اپنے منہ چھپانے کی کوشش کی اور جلدی سے میرے سر پر کپڑا ڈالا اور ایک گندے کپڑے سے میری آنکھیں پر زور سے پٹی باندھ دی۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی آگے سے ہٹا کر پیچھے لگا دی گئی دی اور وہ بھی بالکل ٹائٹ۔

یہ امریکین ہتھکڑی ہوتی ہے اور اس میں چابی سے علیحدہ ایک سوراخ میں پین کرنا ہوتا ہے تاکہ مزید ٹائٹ نہ ہو سکے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ اور گزرا ہوگا، حوالات کا دروازہ کھلا اور دو بندوں نے مجھے اٹھایا اور حوالات سے نکال کر اسی عمارت کے ایک کمرے میں لے گئے۔ مجھے ایک کونے میں دیوار کی طرف بٹھا دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کمرے میں 5 یا 6 بندے تھے جس میں ایک کرسی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پر بیٹھا تھا اور پھر کرسی پر بیٹھا ہوا شخص گویا ہوا یہ آئی ایس آئی کا کرنل تھا اور پشتون تھا اور پشتو میں مجھ سے بولا "عالم زیب مجھے تمہارے خلاف پیچھے سے بہت سخت آرڈرز ہیں کہ میں تمہارے ساتھ بہت سختی سے پیش آؤں مگر میں بھی ایک پشتون ہوں تمہارے ساتھ ویسا پیش نہیں آؤں گا اور پھر اپنے پنٹروں کو شاید اشارہ کیا وہ ایک دم مجھے مارنے لگے مجھے منہ کے بل لٹا کر ڈنڈوں سے مارنے لگے۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ آخر مجھے کیوں مار رہے ہو۔ کرنل نے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ رک گئے پھر کہا کہ تم بولو، کیا کہو گے میں نے کہا کہ میں اداروں کے غیر آئینی اقدام کے خلاف بات کرتا ہوں اور آج مجھے گرفتار کرنے کے بعد کسی عدالت میں پیش کیے بغیر تشدد کا نشانہ بنا رہے ہو یہ کھلم کھلا دہشت گردی ہے اور یہ دہشت گردی صرف اس لئے کر رہے ہو کیونکہ آپ کے پاس وردی ہے۔ یہ کہنا تھا کہ ایک دفعہ پھر مجھے مارنے کا اشارہ ہوا۔ میں اس تشدد کے دوران غیر ارادی طور پر ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی پر زور دے رہا تھا اور وہ مزید کستی جا رہی تھی۔ دوسری دفعہ تشدد کے بعد کرنل نے کہا کہ "عالم زیب میں سیدھی بات کر لیتا ہوں، میں تم سے ایک ویڈیو بناؤں گا جس میں تم کہو گے کہ میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اور جو کہا ہے، وہ میں نے حد سے تجاوز کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے اور اس پر میں معافی مانگتا ہوں۔ میں تم کو فوراً چھوڑ دوں گا۔ میں نے کہا کہ اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کی میں تائید کرتا ہوں، میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔۔ میں اپنی جان پر سے گزر جاؤں گا لیکن ایسی کوئی ویڈیو نہیں بناؤں گا میرے ذہن میں باچا خان بابا کی کتاب گزری۔ باچا خان بابا بیان کرتا ہے کہ جب ہم کو ہری پور جیل میں ڈالا گیا تھا اور ہزاروں خدائی خدمت گاروں کو بند کیا گیا تھا تو حکومت نے ایک سکیم دی کہ کوئی اگر معافی نامہ جمع کروائے تو اس کو فوری رہا کر دیا جائے گا۔ باچا خان بابا فرماتے ہیں کہ مجھے میرے ایک ساتھی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ معافی نامہ دے رہا ہے تو میں نے اسے سمجھایا کہ ایسی غلطی مت کرنا، یہ وقت گزر جائے گا مگر وہ نہ مانا اور معافی نامہ دے کر رہا ہو گیا جب گاؤں پہنچا تو لوگ ہاتھ ملانے کو بھی تیار نہیں تھے کہ باچا خان کو چھوڑ کر آ گئے ہو، پشتون روایات میں لشکر کے ساتھ جو جاتا ہے اس کی لاش واپس آئے مگر

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پیٹھ دکھا کر نہ آئے۔ اس نے بعد میں باچاخان سے جیل میں آکر ملنے کی کوشش کی مگر باچاخان بابا نے ملنے سے انکار کر دیا اور اس نے کچھ دن بعد خود کشی کر لی کیونکہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ برداشت نہ کر سکا۔ یہ کہانی فوراً میرے ذہن سے گزری اور میرے لیے فیصلہ کرنا بڑا آسان تھا کہ چاہے یہ تم کو مار مار کر قتل کر دیں مگر ویڈیو کبھی نہیں بناؤنگا۔ اگر تکلیف سے یہ غلطی کر لی تو میں بھی اپنے ضمیر کا بوجھ برداشت نہیں کر پاؤنگا اور میری غلطی تو کسی بھی صورت میں ناقابل معافی ہو گی چاہے مجھے جس حالت میں سے بھی گزرنا پڑے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر اس طرح میں خود کو جھوٹا ثابت کر لونگا تو وہ جھوٹا صرف میں نہیں ہونگا بلکہ وہ ہزاروں پشتون فیملیز ہوں گے جن کی سچی کہانی اور غم و الم کی داستانوں کو میں نے اپنی صرف زبان عطا کی تھی۔ میں نے ان کو کہا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں، میں غلطی اور خطا کر سکتا ہوں اب تک جو کچھ میں نے کیا ہے ان میں سے کوئی بھی چیز اٹھالو، ثابت کرو کہ وہ اس دلیل یا ثبوت کی بنا پر جھوٹ ہے یا غلط ہے میں سب کے سامنے اس پر معافی مانگوں گا لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتے تو میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر یہ نہیں کرونگا جن کا تم لوگ مجھ سے کہہ رہے ہو۔ اُن کی طرف سے خاموشی ہو گئی۔ ظاہر سی بات ہے یہ تو اسے بھی پتہ تھا کہ جو بول رہا ہے وہ سچ ہے اور اس نے بھی کہا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو بلکے مسلہ یہ ہے کہ تم بول کیوں رہے ہو، پھر کرنل نے کہا کہ میں ذرا فون کر کے آتا ہوں۔ شاید میری بات آگے پہنچانی تھی مگر جاتے ہوئے اپنی پینٹروں کو بولا کہ اسے مارنا نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس دفعہ اور ٹھیک طریقے سے مارنا ہے۔ میرے ہاتھ پیچھے کی طرف ہتھکڑی سے اتنے زور سے بندھے تھے کہ بری طرح پھول گئے تھے۔ شاید کوئی دس منٹ یہ کرنل باہر رہا ہو گا اندر داخل ہوا تو کہا کہ میں نے تو بولا بھی تھا پھر بھی تم لوگوں نے مارا۔ عالمزیب دیکھو جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے ریاست کو نقصان ہے ریاست ماں کی طرح ہوتی ہے ایک گھر میں دو بھائیوں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو اس میں ماں کو گالی نہیں دی جاتی ہم نے کئی سال جنگ لڑی ہے مجھے پتا ہے کہ اس میں قبائلیوں کا بہت نقصان ہوا ہے مگر یہ سب کرنا ضروری تھا۔ میں نے کہا کہ پہلے تو یہ بات غلط ہے کہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ سوکالڈ ریاست ماں ہے اور دوسرا یہ کہ ان دو بھائیوں میں سے ایک نے قبضہ کیا ہوا ہے، وہ اغواکار اور قاتل ہے اور مسلسل ظلم کر رہا ہے اس کے خلاف بات کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ نقصان کو قبائلیوں تک محدود مت کرو یہ کہو سب پشتونوں کا نقصان ہوا ہے۔ ہم سب نے اپنے بچوں کی لاشیں اٹھائی ہیں۔ بچوں کی بات سن کر کہنے لگا تم لوگ اے پی ایس پشاور سکول پر پروپیگنڈا کرتے ہو، اس میں ایک کرنل کا بیٹا بھی شہید ہوا تھا جس سے وہ پاگل ہو گیا۔ کبھی تم لوگوں نے ان کی بات نہیں کی میں نے کہا احسان الاحسان بھی تو آج آپ کے ساتھ ہیں جس نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی تو کہنے لگا مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال کرو گے پھر وہ وضاحت دینے لگا اور کہا کہ وہ ذاتی طور پر اس میں ملوث نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ اُن طالبان کا کیا جو ہر کاروائی میں ملوث رہے آج آپ کے کینٹ میں گوڈ طالبان بن کر بیٹھے ہیں اور انہوں نے ہماری زندگی اجیرن بنا کر رکھی ہیں اور اب بھی انکی وجہ سے بدامنی ہے۔ کرنل نے کہا کہ کونسے مثلاً؟ میں نے نام گنوادیے تو کہنے لگا مجھے اس کے متعلق معلوم نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تم اور منظور کو سید عالم محسود اور علی وزیر جیسے لوگ استعمال کر رہے ہیں جو بیرونی ایجنسیوں کے پیرول پر ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ان سے متعلق بھی بات کر سکتا ہوں لیکن فی الحال تم لوگوں نے مجھے پکڑا ہے تو بہتر ہوگا کہ میرے متعلق بات کرو میں کس کے پیرول پر ہوں جو میں کہہ رہا ہوں کہ پشتونوں کی بربادی میں اپ کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس کی ذمہ دار کون ہے؟ کہنے لگا حکیم اللہ محسود اور فضل اللہ اور بیت اللہ بھی تو پشتون تھے، اس کا ایک بہترین جواب میرے پاس تھا مگر پھر وہ خود ہی کہنے لگا کہ دیکھو امیر اللہ معاویہ کو، لاہور میں ایک دھماکا ہوا تو سرنڈر ہو گیا۔ تب میں نے کہا کہ اچھا امیر اللہ معاویہ کہاں پر لڑ رہا تھا، یہی امیر اللہ معاویہ جب میری زمین پر فساد پھیلا رہا تھا کیا اس کا حساب اس سے نہیں لینا چاہیے؟ کیا آپ کے پاس معیار پنجاب ہے کہ جو وہاں دہشت گردی کرے تو دہشت گرد ہے جو پختونخواہ میں قتل و غارت گری کرے وہ دہشت گرد نہیں اور اس کو معافی بھی مل جاتی ہے۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، مگر ایک دفعہ پھر کہا کہ میں ذرا فون کر کے آتا ہوں "عالمزیب! اس کے بعد آکر پازیو

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

باتیں کریں گے"۔ اپنے پینٹروں کو کہا کے دیکھو ابھی کچھ بھی مت کہنا میں تو سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا تھا وہ نکلا اور مجھ پر تشدد شروع ہو گئی پھر جا کر میرے کپڑے اتار دیے اور جسم پر زخم کے نشان تھے اس کو ملنے لگے تا کہ جہاں خون جمع ہو وہ نرم ہو اور پھیل جائے اور مجھے مسلسل گالیاں دے رہے تھے اس کے بعد کرنل اندر آیا اور کہا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ اب کچھ مت کرنا اور وہ ان پر چیخا جو کے ظاہر ہے میرے سامنے ڈرامہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کہا "عالمزیب دیکھو میں نے ان کو کہا تھا کہ نہیں مارنا، چلو اب پازیٹو باتیں کرتے ہیں"۔ میں بالکل خاموش رہا اس نے کہا کہ اب مجھ سے بات نہیں کرو گے۔ میرے لئے مار ایک طرف مگر انہوں نے مجھے جو گالیاں دی تھیں وہ دوسری طرف۔ میں نے کہا تم سے بات کرنا بیکار ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو میں ان کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں اور پھر بڑی بے غیرتی سے اپنے پینٹروں کو اردو میں بولا کہ دیکھو پٹھان سب کچھ برداشت کر لیگا لیکن گالی برداشت نہیں کرتا اور ایک دفعہ پھر سے مجھ سے معافی مانگی۔ جب کے میں نے واضح کر دیا کہ اس طرح بات نہیں ہو سکتی، میں کہاں ہوں اور تم کہاں ہو؟ اس نے اشارہ کیا کہ اسے اٹھاؤ اور ہاتھ کھولو، ہتھکڑی نے میرے ہاتھ بری طرح سے زخمی کر دیے تھے بلکے اس کے زخم کے نشان اب تک کہ جیل میں مجھے مہینے ہو چکے ہیں وہ نشان پڑے ہیں۔ بہر حال ہتھکڑی پیچھے سے آگے کی طرف لگائی گئی اور کرنل نے اپنی کرسی مجھے دی اور خود میرے خیال سے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا اور کہا کہ دیکھو اگر تم مجھ سے دلیل مانگو گے، وہ میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارا دماغ تبدیل کر سکتا ہوں اور پھر پاک افغان سیاست اور امریکی خطرات بتانے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ تم لوگ قربانی کے بکرے ہو جو ہر دفعہ ذبح کئے جاتے رہو گے اور یہ کے اگر پاکستان کو زندہ رکھنا ہے تو افغانستان کی تباہی ضروری ہے۔ میں نے آخر میں کہا کہ دیکھو میں اپنی قوم کی بقا اور زندگی کی بات کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ ابھی قرآن شریف لے آؤ میں بھی ہاتھ رکھتا ہوں اور تم بھی رکھو کہ جو ظالم ہو گا اس کو ظالم کہیں گے اس ظلم کو ہونے سے روکیں گے اور جہاں ظلم ہوا ہو گا اس کا تدارک کریں گے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوا کیونکہ مسئلہ یہ نہیں کہ جھوٹ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

بولا جارہا تھا، پتہ تھا کہ سچ ہے مگر مسئلہ یہ تھا کہ بولا کیوں جارہا ہے۔ پھر اس نے چائے منگوائی اور جاتے ہوئے پھر سے معافی مانگی اور کہا کہ جب نکلنا تو اس کا دیہان کرنا کہ ملک دشمن عناصر کے کام نہ آؤ یعنی لراو بر افغان کی تباہی پر چھپ رہنا اور اسکا ایک مطلب اور بھی تھا کہ مجھ پر کیس ڈالا جائے گا کیونکے میں نے انکا مطالبہ پورا نہیں کیا تھا۔ مجھے واپس لا کر حوالات میں ڈال دیا گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے بندے سے پوچھا کہ کونسی جگہ ہے تو اس نے کہا مجھے نہیں پتا۔ ایک سے دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ایک دفعہ پھر سے حوالات کا دروازہ کھلا میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی اور مجھے ایک آفس میں لے آئے اور تب میں نے جانا کہ یہ ملیر کینٹ تھانا ہے۔ توڑی دیر بعد صوبائی وزیر ناصر حسین شاہ ملنے آئے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ملیر کینٹ میں میرے پانچ دن

مجھ سے سندھ کے صوبائی وزیر ناصر حسین شاہ ملاقات کے لیے آئے تھے اس کے ساتھ وکلاء بھی تھے اور اس نے کہا کہ بلاول بھٹو نے تمہاری گرفتاری کی مذمت کی ہے اور پیپلز پارٹی کی طرف سے وکیل کا اعلان بھی کیا ہے۔ جب میں نے اسے اپنے ساتھ ہونے والی تھانے کے اندر کی صورتحال کے بارے میں بتایا تو اس نے بڑی بیزاری سے کہا کہ اس ملک کو یہاں اسٹیبلشمنٹ نے مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ رخصت ہوئے تو فون پر بھی بات کروائی گی۔ بلاول ہاؤس میں موجود شیر محمد محسود اور نور اللہؒ ترین سے بات ہوئی، انھوں نے پوچھا، کیا تشدد ہوا ہے مین نے کہا کہ ہاں۔ پوچھا کون تھے پولیس والے یا ماما گان، میں نے کہا ماما گان۔ انہوں نے کہا کہ فکر مت کرو پورے ملک میں احتجاج کے لیے لوگ نکلے ہیں اور اس کا اندازہ مجھے تب بھی ہوا تھا کہ جب ائی ایس ائی والے تشدد کے بعد چائے پلا رہے تھے تو میرے سامنے بیٹھے ایک اہلکار سے غلطی سے ایک ویڈیو آن ہوئی جس میں لوگوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے کہ شرم کرو حیا کرو، عالم زیب کو رہا کرو۔

اس نے ویڈیو فورا بند کر دی لیکن تب تک میں سُن چکا تھا جب ناصر شاہ جا رہا تھا تو اس نے پولیس تھانے دار کو ہدایات دیں کہ اس کا بہت اچھا خیال رکھا جائے۔ اچھا خیال وہ کیا رکھتے، پیچھے خاکی وردی کا حکم تھا کہ جتنا ذلیل کر سکتے ہو اس کو کرو اور بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ باقاعدہ فون کر کے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہدایات دی جاتی تھیں، یعنی آنکھوں پر پٹی ہے کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوتی تھی تو کر دی جاتی۔ ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہیں یا پیچھے کی طرف؟ آگے کی طرف ہوتے تو پیچھے کی طرف باندھ لیتے تھے اور رات کو ہاتھ زمین میں موجود ایک سلاخ کے ساتھ جانوروں کی طرح باندھ لیتے تھے۔ جب ناصر حسین شاہ رخصت ہوئے تو مجھے واپس حوالات میں ڈالا گیا۔ ہتھکڑی ناصر شاہ کے ساتھ ملاقات میں بھی لگی ہوئی تھی اور اس کی ہدایت کے باوجود حوالات کے اندر بھی رہی۔ پھر ایک اہلکار آیا اور پوچھا کہ میں کھانا لے آؤں، میں نے کہا کہ لے بھی آؤ گے تو کھاؤں گا کیسے، میں ہتھکڑی کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔

اس نے کہا ہتھکڑی تو نہیں کھلے گی، میں نے کہا پھر کھانا لانے کی زحمت بھی نہ کریں۔

پچھلی رات کو بھی کراچی میں سخت بارش ہوئی تھی اور اس دن بھی بارش ہوئی اور شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں شروع ہو گئی تھیں۔ کراچی میں پورے سال ایک ہی قسم کا موسم رہتا ہے سوائے جنوری میں جب شمال کی جانب سے ٹھنڈی ہوائیں آجاتی ہے اور اس سال یہ چند دن ریکارڈ سردی کے تھے۔ میرے ساتھ عابد آفریدی کی کورٹ میں پیشی تھی اور وہ وہاں سے یہ خبر لے کر آیا کہ اس دفعہ 7 اور 6 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت چل رہا ہے اور یہ سردی میں نے اس ننگے فرش پر صرف اپنی ایک چادر میں گزاری۔ وہ بھی ایسی حالت میں کہ ہاتھوں میں ہتھکڑی ہوتی اور میں بڑی مشکل سے چادر اپنے اوپر اوڑھتا اور جب زمین میں سلاخ کے ساتھ باندھ لیتے تب تو کروٹ بھی نہ بدلا جا سکتا۔ ملیر کینٹ تھانے میں کل پانچ دن اور پانچ راتیں میں نے اس حالت میں گزاریں۔ پولیس والے کہتے کہ خان صاحب ناراض مت ہونا، ہمیں معلوم ہے کہ یہ بہت غلط ہو رہا ہے مگر ہم مجبور ہیں، اگر ایسا نہ کیا تو کل کو ہماری بھی لاش پھینکی جائے گی۔ میری چادر نے میرا بہت ساتھ دیا۔ یہ اون کا بنا ہوا چادر تھا اگرچہ اس سخت سردی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی بہت کام دیا۔ یہ نہ ہوتا تو شاید میں سردی سے مر جاتا۔ جب میں ڈی آئی خان سے آ رہا تھا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ کراچی میں گرمی ہے لیکن میں نے سوچا کہ خیر ہے کم از کم چادر لے جاتا ہوں جب کراچی

Scanned with CamScanner

آیا تو واقعی لگا کے شاید چادر لے کر آنا غیر ضروری تھا مگر اللہ کو تو ہر چیز کی خبر تھی۔ مجھے اس کی اہمیت ملیر کینٹ تھانے میں لگی۔ اگلی صبح گیارہ بجے مجھے حوالات سے نکالا گیا اور پھر رہنمائی کرتے رہے کہ کہاں بڑا قدم لینا ہے اور کہاں پاؤں اوپر کرنا ہے اور سر نیچے کر کے بچانا ہے۔ اس طرح مجھے بکتر بند گاڑی کے اندر بٹھایا گیا جب چل پڑی تو بکتر بند اکیلی نہیں تھی، چار پانچ پولیس موبائل آگے تھیں اور اتنی ہی تعداد میں پیچھے تھیں۔ اُس ٹائم مجھے ایسا لگا کہ شاید مجھے ان کاؤنٹر کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ میرے سامنے نقیب اللہ شہید کی شہادت کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔ اُس کو بھی ایسے ہی لے کر جا رہے ہوں گے، اس کے دل میں کیسے کیسے خیالات آئے ہوئے ہوں گے، کیا اُسے معلوم ہوا ہو گا کہ اب میرے ساتھ یہ لوگ کیا کریں گے؟ راؤ انوار (جانور) کے لیے تو یہ ایک فُل فرائی والا معاملہ تھا جس پر اُسے میڈل لگنے تھے۔ اس کو تو پشتون ملے ہیں۔ ان سے پیسے نکالو، نہیں تو فُل فرائی اور میڈل الگ سے۔ کیوں کہ اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، ایم آئی اور آئی ایس آئی کا چہیتا جو تھا اور ان کے دیئے ہوئے بندے راؤ انوار ماورائے عدالت قتل کرتا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو روانہ ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تو نے مجھے اتنے بڑے ظالم کے خلاف حق کی بات کرنے کے لیے چُنا، اب مجھے کوئی فکر نہیں کہ مجھے بھی نقیب اللہ اور ان جیسے ہزاروں مظلوموں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ یہ گاڑی کافی چلی پھر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ اندازہ ہوا کہ شاید یہ کورٹ ہے۔ پھر مجھے باہر نکالا گیا میری آنکھوں سے پٹی تو ہٹائی گئی تاکہ میں راستہ دیکھ سکوں لیکن جو بھی کپڑا ان کو ملا میرے سر پر لاد دیا۔ تو ڑا آگے گئے ہوں گے کہ ایک دم لوگوں نے نعرے لگائے "عالم زیب زندہ باد" میں سمجھ گیا کہ ہائی کورٹ میں پیش ہو رہا ہوں۔ میرے ساتھی میرے قریب قریب چل رہے تھے اور بات بھی کرنا چاہتے تھے مگر میں کوئی جواب نہیں دے پایا، وجہ یہ تھی کہ میری گاڑی میں جو نقیب اللہ کے لئے جو خیالات ابھرے تھے اور یہاں میرے لوگوں کے نعرے اس نے مجھے کچھ بھی کہنے کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہاں ہمارے وکلا موجود تھے جس میں ایک نے پشتو میں کہا کہ عالمزیب فکر مت کرو، ہم سب آئے ہیں۔ (بعد میں پتہ چلا وہ ہمارے

(c) ketabton.com: The Digital Library

کوئٹہ کے ایک وکیل ولی افغان ایڈووکیٹ تھے)۔ کورٹ میں میری شکل دکھائی گئی اور واپس بکتر بند گاڑی میں چڑھایا گیا۔ جب میرے کیس کا تفتیشی افسر آیا تو اس نے کہا کہ چار دن کا ریمانڈ ملا ہے یعنی چار دن مزید اس جہنم میں گزارنے تھے۔ مجھ پر کیس سوراب گھوٹ تھانے کا تھا مگر مجھے ملیر کینٹ تھانے میں رکھا گیا تھا اس کا مطلب صاف تھا، تاکہ میں انٹیلی جنس اداروں کے ہاتھوں میں رہوں اور مجھے وہ یہ تکلیف دے سکیں۔

راستے میں بکتر بند گاڑی کا تیل ختم ہو گیا اور ڈرائیور جو سندھی تھا، نے کہا کہ ڈیزل 1000 روپے کا ڈالا تو تھا۔ ایک ہزار کے ڈیزل پر بکتر بند کہاں چلتا ہے بہر حال میرا تفتیشی افسر اس پر جز بز ہوا۔ مجھے پولیس موبائلوں میں سے ایک پر چڑھا دیا گیا اور مجھے واپس لایا گیا۔ تفتیشی افسر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے کہا کھانا تو نہیں کھایا مگر آپ صرف اتنا کریں کہ ان کو کہیں کہ حوالات کے اندر کم از کم مجھے نہ باندھا کرے۔ اس نے بھی پولیس والوں کو بہت سختی سے کہا مگر یہ ریلیف چند گھنٹے کا تھا میرا تفتیشی افسر کھانا لے آیا لیکن میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ایک دو لقموں کے علاوہ نہ کھاؤں کیونکہ مجھے پتا تھا کہ لیٹرین کس قدر گندہ تھا اور اوپر سے ہتھکڑی ہاتھوں میں ہو گی۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ ان پانچ دنوں میں میری بھوک جانے کہاں چلی گئی تھی۔ لیٹرین میں بہت مشکل سے صرف وضو بنا لیتا اور شام کو جب نیچے سلاخ کے ساتھ باندھ لیتے تو نماز ایسے پڑھتا کہ ایک ہاتھ سلاخ میں ہوتا اور ایک گھٹنے پر اور نماز اشاروں سے کر لیتا۔ عابد آفریدی سے بات چیت ہو جاتی۔ اور وہ بھی جتنا اس سے ہو سکتا تھا میری خدمت کرتا رہتا۔ آخری دن جب اس کو جانا تھا تو کہا کہ کاش میں تمہارے لئے کچھ کر پاتا۔ اس کے جیب میں دو سو روپے پڑے تھے، وہ دے دیئے، کہا ہو سکتا ہے کہ تمہارے کام آئے۔ وہاں ایک ایک سیکنڈ بہت تکلیف سے گزرا جس اگلے روز کو کورٹ میں دوبارہ پیشی تھی اس دن عصر کے وقت مجھے حوالات سے نکال کر پھر سے بکتر بند میں سوار کیا گیا، حیران ہوا کہ کل میری پیشی ہے تو اب کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا اس وقت کہاں لے کر جا رہے ہو تو ڈرائیور نے کہا تمہارے گھر تمہیں لے کر جا رہے ہیں۔ مجھے بکتر بند میں تیل ختم ہونے

Scanned with CamScanner

کی بات یاد تھی میں نے پوچھا کہ ڈیزل کتنے کا ڈالا ہے۔ اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا کہ اگر 1000 کا ڈیزل ڈالا ہے تو اس میں ہم کبھی بھی گھر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس پر سب بہت قہقہے لگا کر ہنسے۔ اس دفعہ مجھے گارڈن سی ٹی ڈی سینٹر لے آئے تھے اور یہ بات مجھے دو چیزوں سے پتا چلی۔ پہلی بات تو یہ کہ انکا حوالات ایک بند بلڈنگ کے اندر چھوٹے چھوٹے سیلز کی صورت میں تھا جس طرح انٹرنمنٹ سینٹرز ہوتے ہیں گویا یہ عام پولیس کا تھانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگلے روز جب مجھے عدالت میں پیش کر رہے تھے تو بہت جلد عدالت پہنچیں تھے اور گارڈن سی ٹی ڈی سینٹر ہائی کورٹ کے نزدیک ہے تو مجھے پتا چلا کہ میں گارڈن سی ٹی ڈی والوں کے پاس تھا جس کے بارے میں بہت ساری ظلم کی داستانیں سنی تھی۔ یہاں رات کو کھانے کے لئے پوچھا گیا جس کے لیے میں نے منع کر دیا البتہ یہ درخواست کی کہ اگر میری ہتھکڑی ہٹائی جائے جو کہ منظور نہیں ہوئی۔ یہ جگہ گرم تھی کیونکہ ایک بند بلڈنگ کے اندر چھوٹے سیل بنائے گئے تھے، باہر کی ہوا اندر نہیں آتی تھی۔ ملیر کینٹ تھانے کا حوالات تو باہر کی طرف تھا، کھڑکی اور دروازے کے سلاخوں سے تیز ہوائیں اندر آتی تھیں۔ اگلی صبح چائے اور پراٹے لائے گئے، کھانے سے تو میں نے اعتراض کیا البتہ چائے پی لی۔

وہاں سے جب لانے لگے تو بکتر بند میں دو ایلیٹ فورس کے جوان بٹھائے گئے تھے، آگے بھی ایک پولیس کا اہلکار تھا اور ایک ڈرائیور۔ وہ سب چھپ تھے، میں تو ویسے بھی چھپ تھا، ساتھ میں وہ خوفزدہ تھے کہ نہ جانے کتنے بڑے دہشت گرد کے ساتھ جا رہے ہیں۔ کورٹ پہنچے تو کافی ٹھہرے مگر خاموشی یوں ہی برقرار رہی۔ بلآخر ہماری خاموشی تب ٹوٹی جب میرا تفتیشی افسر اندر آیا اس نے کہا، یار کیا کر رہے ہو، اس سے چادر وغیرہ ہٹاؤ۔ یہ کوئی ایسا ملزم تھوڑی ہے تب مجھ سے پردہ ہٹا اور میں نے ان کو دیکھا اور انہوں نے مجھے۔ تفتیشی افسر کو میں نے کہا کہ شاہد آپ تو مجھے ملیر کینٹ میں چھوڑ کر بھول ہی گئے تھے۔ اس نے پوچھا کیوں کیا ہوا؟ میں نے کہا تمہارے جانے کے بعد میری وہی حالت کر دی گئی بلکہ اس سے بھی بدتر۔ وہ بہت افسوس کرنے لگا، میں نے کہا کیا میری

(c) ketabton.com: The Digital Library

تفتیش رہتی ہے۔ اس نے کہا کہ یار تمہاری کونسی تفتیش ہے، جو تھی وہ اس دن گاڑی میں ہی کرلی تھی۔ میں نے کہا پھر مجھے جیل کسٹڈی کروادو۔ اس نے کہا چلو ٹھیک ہے میں جیل کسٹڈی کی درخواست دے دیتا ہوں۔ وہ چلا گیا اور میرے اور ان اہلکاروں کے درمیان خاموشی ٹوٹی۔ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کس معاملے میں آئے ہو اور میں نے ساری کہانی انہیں سنائی وہ بہت متاثر ہوئے اور پھر جب تک وہاں بیٹھے رہے یا جیل کسٹڈی کروانے آئے برابر اپنے پولیس کیریئر کے مزاحیہ واقعات سناتے رہے اور میں اتنے دنوں میں پہلی بار بہت ہنسا تھا۔ ساتھ میں گرم اور ٹھنڈا بھی میرے لئے منگواتے رہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہاں جیل میں اتنے مہینوں سے اکیلے رکھنے کا ان کا یہ جواز ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کہ میں لوگوں کے دماغ خراب کرتا ہوں یا کسی پر میرا سایہ بھی ناپڑے، یہ اسلئے کیونکہ حق اور سچائی دل کو لگتی ہے اور میرے پاس کوئی جادو کا چراغ تو نہیں، صرف حق اور سچ کے ہتھیار ہے اور جس سے بھی بات کرتا ہوں اسے نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ مجھ سے بہت مانوس بھی ہوا اور جیل میں کئی دفعہ میرے لئے پولیس اہلکاروں اور عام قیدیوں نے رسک اٹھائی ہے۔

مجھے جب جیل لایا گیا تو پہلی آمد کے تمام مراحل سے گزر کر جیلر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے مقدم قیدی کو کہا کہ مجھے بند وارڈ بھیج دیں۔ یہاں لا کر مجھے ایک کوہلی (کال کوہٹری) میں ڈالا گیا۔ میری خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔ یہاں تو نہ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی نہ زمین پر سلاخ جس سے باندھا جاتا۔ کوہلی بھی صاف تھی اور لیٹرین بھی صاف تھا۔ دو کمبل بھی دیے گئے۔ میں ہفتے کے دن 26 جنوری 2019 کو لایا گیا تھا اور ہفتے کو رات کے لیے سبزی کھانے کو ملتی ہے۔ میں نے پچھلے 5 دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب یہاں پوری ایک روٹی کھائی اگرچہ معدہ قبول نہیں کر رہا تھا. اس رات میں نے بہت مزے سے آرام کیا اور ہاتھ کو جب ہتھکڑی سے آزاد پاتا تو بہت خوشگوار احساس ہوتا۔ بہر حال تھا تو بند وارڈ میں ہی، جہاں جیل میں سنگین غلطی کرنے پر سزا کے طور پر قیدیوں کو چند دن کے لیے رکھا جاتا ہے۔ بعد میں کورٹ کی طرف سے کئی دفعہ ہدایات دینے اور (بی کلاس)

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اسٹیٹس ملنے کے باوجود مجھے بند وارڈ سے نہیں نکالا گیا۔ اب 7 ماہ بعد صرف اتنا ہوا ہے کہ ایک گھنٹے کے لئے کوٹھی سے باہر ٹہلنے کے لئے نکلتے ہیں۔ چارپائی دی گئی اور نمازِ جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کرنے کی اجازت ملی جو کہ دو سپاہی ہمراہ جاتے ہیں اور نماز کے فوراً بعد واپس لے آتے ہیں۔ اب ایک ریلیف یہ بھی ملا ہے کہ ملاقاتی اگر کتاب بھجوا دیتے ہیں تو چھوڑ دی جاتی ہیں اگرچہ ایک کتاب جو کہ آئینِ پاکستان کے بارے میں تھی وہ نہیں چھوڑی۔ میری کتاب کے لئے یہاں بھوک اتنی ہے جتنی ایک سخت بھوکے کو کھانے کے لئے ہو سکتی ہے۔ اب میں جیل والوں سے سہولت کا نہیں کہتا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ پیچھے سے خاکی وردی کا زور ہے۔ وہ کہتے ہیں نا، کہ جھوٹ بولو تو اللہ ناراض ہوتا ہے اور سچ بولو تو پاکستان کی فوج ناراض ہوتی ہے مگر یہ کتنے نادان ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے بند وارڈ کرنے سے حق و سچائی بھی بند وارڈ ہو جائے گی۔

28 اگست 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

لاپتہ افراد کے ساتھ

انٹرنمنٹ سینٹرز میں کیا ہوتا ہے

سال 2016 کی بات ہے جب مجھے میرے ایک دوست نے فون کیا، پوچھا کہاں ہو؟ میں ڈیرہ اسماعیل خان سے باہر کسی کام سے نکلا تھا۔ میں نے جگہ بتادی، اس نے کہا جلدی سے جناح ہسپتال آ جاؤ۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے، اس نے کہا آ جاؤ کچھ دکھانا ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان شہر چھوٹا ہے، میں پانچ منٹ میں ہسپتال پہنچا۔ مجھے میرا دوست ایک کار کی طرف لے گیا۔ فرنٹ ڈور کھولا، اندر ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کی تازہ تازہ داڑھی نکلی تھی لیکن انتہائی نحیف اور لاغر تھا۔ میں نے ہاتھ ملانا چاہا مگر اس سے ہاتھ نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ لوگ باہر ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں نیورو سرجن آ گیا اور اس نے وہیں پر اس کا ابتدائی معائنہ کیا، ڈاکٹر کو کہانی پہلے ہی بتادی گئی تھی تو جب معائنہ کیا تو بڑے غصے میں کہا کہ فوج کو کہہ دیتے کہ اس کو کڑاہی میں ڈال کر کھا جاتے کیونکہ یہی کرنا باقی رہ گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کہیں لاپتہ افراد کا معاملہ ہے۔ یہ نوجوان لڑکا اپنے گردن سے نیچے کچھ بھی محسوس نہیں کرتا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا کہ ہمیں کالی اندھیریوں میں رکھتے تھے، ہمارے جسم پر سفید دھبے نکل آتے تھے تب میں بہت چیختا اور روتا تھا، پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے نکال کر دھوپ میں لے جاتے، جب دھوپ سیکتا تو سفید دھبے ختم ہو جاتے اور ہمیں واپس کال کوٹھریوں میں ڈال دیتے۔ پتہ نہیں مجھے کتنا عرصہ ہوا لیکن میں دن بدن اپنے اعضاء کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھے۔ پہلے پیروں نے کام کرنا چھوڑ دیا اس طرح کرتے کرتے بات گردن تک آ گئی۔ اب میں گردن سے نیچے کچھ محسوس نہیں کرتا۔ یہ بات بڑی مشکل سے اس نے پوری کی اور میں حیرانگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے کپڑے دیکھے تو انتہائی پرانے اور بوسیدہ تھے میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ اس کے کپڑے اور نہیں تھے کیا۔ اس نے بتایا کہ یہ وہی کپڑے ہیں جس میں اس کو چھ سال پہلے اٹھایا گیا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی گھر کے دروازے پر لیٹا کر گئے ہیں۔ گھر والوں نے جب

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

دیکھا تو سب کی حالت غیر ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے لیے تو سب کے سب پاگل ہو گئے تھے۔ کسی کا کپڑے کی طرف دھیان گیا ہی نہیں اور اب ہسپتال لے آئے ہیں۔

جب اسے گھر واپس لے کر چلے گئے تب میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ اس کی کہانی سناؤ اس نے کہا کہ آج سے کوئی 6 سال پہلے کی بات ہے جب یہ بچہ تھا اس وقت یہ چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کا ایک بھائی طالبان میں تھا جو کہ ابھی بھی ہے اور افغانستان میں ہے اور اپنے ماں باپ سمیت کسی کی ایک نہیں مانتا۔ چھ سال پہلے سیکورٹی اداروں نے گھر سے اس بچے کو اٹھالیا اور کہا تھا کہ اس کا بھائی آجائے تو ہم اس کو چھوڑ دیں گے اسکے بھائی نے پیغام بھیجوایا تھا کہ اس کو پھانسی بھی دے دو مجھے کوئی پروا نہیں۔ اس طرح انہوں نے اس بچے کو چھ سال رکھا۔ اب انہیں اندازہ ہوا کہ یہ تو ویسے ہی مر جائے گا اور ہم نے ایک گوڈ طالبان کمانڈر کے ذریعے سفارش کروائی تو آج گھر پر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ باقی حال تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے کہا کہ اگر اسکو اٹھایا نہ جاتا تو یہ اب کالج پاس کر چکا ہوتا، شاید یونیورسٹی جاتا۔ میرے دل سے ایک بد دعا نکلی کہ خدا ان ظالموں پر لعنت کرے جس نے ایک بچے کا روشن مستقبل تباہ و برباد کر دیا اور گھر والوں کو کس جہنم پر سے گزارا ہے۔

جب ہم نے لاپتہ افراد پر باقاعدہ کام شروع کیا اور میں کئی ایک رہا ہونے والے قیدیوں سے ملا تو انہوں نے جو اپنی کہانیاں سنائی، جو کچھ ان کے ساتھ انٹرنمنٹ سینٹرز میں ہوتا رہا ان سب کا خلاصہ میں یہاں لکھوں گا لیکن اس سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ جس طرح ہم نے لاپتہ افراد کے گھر والوں کے انٹرویوز کئے، اسطرح رہا ہونے والوں کے انٹرویوز نہیں لئے۔ اس کی دو وجہ تھیں، ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب یہ لوگ زیادہ تعداد میں رہا ہونا شروع ہوئے تو ہم نہیں چاہتے تھے کہ ان کے انٹرویو لے کر رہا ہونے کا سلسلہ بند ہو جائے جو کہ ظاہر ہے وہ رہا کرنا بند کر دیتے اور یہی بات ان کی طرف سے رہائی پانے والوں کو کی جاتی تھی کہ خبردار! جو تم لوگ پی ٹی ایم والوں سے ملے یا ان کو انٹرویوز دیئے۔ ہمارے لئے تو بس یہی کافی تھا کہ وہ رہا ہو کر آئے اگرچہ ہمارا مطالبہ شروع دن سے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ تھا کہ ان کو عدالت میں پیش کیا جائے مگر عدالت میں تو اس وقت پیش کرتے، اگر ان کے پاس ثابت کرنے کے لئے کچھ ہوتا۔

انٹرنمنٹ سینٹرز وہ جگہیں ہیں جہاں پر لاپتہ افراد کو رکھا جاتا ہے ویسے تو ہر شہر میں ہوتے ہیں لیکن زیادہ لوگوں کو رکھنے کی گنجائش کے حوالے سے چند مشہور ہیں۔ خیبر پختونخوا میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان میں لکی مروت انٹرنمنٹ سینٹر، کوہاٹ، پشاور، مردان، سوات زیادہ مشہور ہیں۔ ان سینٹرز کو آج کل زیادہ تر (ایم آئی) ہینڈل کرتی ہے اگرچہ باقی اداروں کے پاس اپنے بھی ہیں یعنی (ایف آئی اے) اور (آئی ایس آئی) کے پاس اپنے ہیں۔ اور (سی ٹی ڈی) والوں کے پاس اپنے ہیں مگر (سی ٹی ڈی) انٹرنمنٹ سینٹرز میں زیادہ عرصے کے لیے افراد نہیں رکھے جاتے اکثر اوقات (سی ٹی ڈی) کو لاپتہ افراد اس وقت دیئے جاتے ہیں جب انہیں ماورائے عدالت قتل کرنا ہوتا ہے یا پھر عدالت میں پیش کر کے کیس کرنا ہوتا ہے۔ انٹرنمنٹ سینٹرز میں جہاں قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے سیلز کی شکل میں ہوتا ہے، سیلز کے دروازوں کی سلاخوں کے آگے ایک راہداری ہوتی ہے جہاں پر ایک اہلکار جس کو منشی کہتے ہیں، ہر وقت ٹہل رہا ہوتا ہے یعنی اسکے سوا کسی کو نہیں دیکھا جا سکتا، کہاں سے سورج چڑھتا ہے اور کہاں غروب، ساتھ والے سیل میں کون ہے، کیا ٹائم ہے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ نماز کا بتایا جاتا ہے تو اس سے اندازہ لگتا ہے۔ ہر سیل میں ایک سے لے کر چار بندوں کو رکھا جاتا ہے۔ اندر باتھ روم نہیں ہوتا، خالی بوتلیں دی جاتی ہیں جس میں چھوٹا پیشاب کیا جاتا ہے اور جب وہ بھر جاتی ہیں تو انکو لے جا کر خالی کیا جاتا ہے۔ نماز کے لئے تیمم کیا جاتا ہے چونکہ پانی سے وضو کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثریت انٹرنمنٹ سینٹرز کا حال ہے، چند ایک کے یہاں سیلوں کے اندر پانی کی ٹوٹی ہوتی ہے جہاں پر وضو کیا جا سکتا ہے اور سخت گرمیوں میں اجازت لے کر نہایا جا سکتا ہے۔ قضائے حاجت کے لیے دن میں ایک دفعہ لیٹرین کیلئے لے کر جاتے ہیں جس کا ٹائم ایک سے دو منٹ تک کا ہوتا ہے، اس میں اگر کچھ کر پائے تو ٹھیک، نہیں تو فوراً نکالا جاتا ہے اور یہ اہلکاروں کے رویے پر بھی کچھ حد تک منحصر ہوتا ہے اگر تھوڑی بہت انسانیت ان

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں ہوئی تو ایک منٹ اضافہ بھی کر لیتے ہیں۔ چند سالوں سے ان قیدیوں کو انٹر نمنٹ سینٹر کا اپنا ایک لباس بھی پہناتے ہیں اور ہر ادارے کا اپنا لباس ہے۔ سیل کے اندر کیمرے اور آواز کو کھینچنے والے آلے نصب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات حکم دیا جاتا ہے کہ کیمروں کی طرف منہ کر کے بیٹھو اور اس طرح بناء ٹیک لگائے گھنٹوں بٹھایا جاتا ہے۔ اگر غلطی سے وہاں کسی سے بات کی تو اس کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ انٹر نمنٹ سینٹر میں ٹارچر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے جس افسر کو کوئی قیدی تفتیش کے لئے دیا جاتا ہے، اس افسر کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے کہ اگر تفتیش کے دوران قیدی مر گیا تو اس کو کچھ ڈر نہیں ہوتا، اس سے کوئی سوال نہیں ہوگا، بلکے اکثر آفیسر اپنی کارگردگی بدترین ٹارچر کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ جب قیدی مر جاتا ہے تو انٹرنیٹ سینٹر کے اندر قبرستان میں دفنا دیتے ہیں یا پھر کسی سڑک پر پھینک دیتے ہیں یعنی وہی نامعلوم افراد والا قصہ بنادیا جاتا ہے۔

جب (آئی ایس پی آر) نے کہا تھا کہ ہر لاپتہ فرد کو ہمارے ساتھ نہ جوڑا جائے، اس میں کئی ہمارے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے ہوں گے، میں کہتا ہوں کوئی انٹر نمنٹ سنٹر جائے، بہت سے لوگوں کی قبریں مل جائیں گی یعنی یہ زنجیروں میں جھکڑے لوگ ان کے خلاف انٹر نمنٹ سینٹرز میں لڑ رہے تھے؟

ٹارچر ہر طریقے سے اور ہر قسم کا ہوتا ہے کبھی کبھی میں دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ یہ کتنے منافقانہ انداز میں کشمیر میں ہونے والے ظلم اور وہاں کشمیریوں پر بھارتی فوج کے ٹارچر ایسے انداز میں بتا رہے ہوتے ہیں کہ جیسے خود تو انسانیت کے بہت بڑے پیامبر ہے۔ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو ٹارچر اور انسانیت سوز سلوک یہ کرتے ہیں شاید ہی تیسری دنیا کے ممالک میں ایسا ظلم وہاں کے اتھارٹیز کرتی ہونگی۔

ٹارچرز میں ہاتھ اور پاؤں کے ناخن اُکھاڑنا، انگلیاں توڑنا چین پولی کے ساتھ الٹا لٹکانا، پانی کے ڈرم میں کھڑا کر کے بجلی کے جھٹکے دینا، ہاتھوں کو پیچھے کی طرف ہتھکڑی دے کر پھر اُسی ہتھکڑی سے رسی باندھ کے چین پولی سے اٹھانا (اکثر لوگ جو بھاری ہوتے ہیں انکے بازو کے جوڑ اکھڑ جاتے

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہیں)، سٹریچر پر الٹا لیٹا کر ہاتھ اور پاؤں اور سینے کو بیلٹ سے باندھ کر ڈنڈوں سے مارنا، یہ وہ ٹارچر ہے جو عام طور پر دیا جاتا ہے۔ خاص قسم کا ٹارچر اس کے علاوہ ہے جس میں کم ہی لوگ زندہ بچتے ہیں۔ ملیر کینٹ میں واقع انٹرنمنٹ سینٹر کے گراؤنڈ فلور میں ایک کمرہ ہے، اس طرح کے کمرے ہر انٹرنمنٹ سینٹر میں بنائے گئے ہیں۔ ان میں ایک سٹریچر پڑا ہوتا ہے جس پر بیلٹ لگے ہوتے ہیں جس سے بندے کو باندھ لیا جاتا ہے، اسطرح بلکل حرکت نہیں کر سکتا۔ ایک میز پڑا ہوتا ہے جس میں ہر قسم کے اوزار پڑے ہوتے ہیں یعنی ناخن اُکھاڑنے والے اوزاروں سے لے کر تیز دھار خنجروں اور ڈریل مشینوں تک۔ ایک کرسی پڑی ہوتی ہے اور اس میں باندھنے کے لیے بیلٹ ہوتے ہیں، اس مین ہائی وولٹیج کرنٹ دیا جاتا ہے۔ دیوار پر بے شمار تصویریں لگی ہیں جس میں ہاتھ کی انگلیوں کے کاٹنے کی تصویریں، سینے، پیٹ اور رانوں میں بڑے بڑے کاٹ کے نشان، آنکھیں نکالنے کی تصویریں، چھاتی کے کاٹنے کی تصویریں ایک طرح سے پورا ایک آپریشن تھیٹر ہوتا ہے جہاں سے واپس زندہ نکلنے کے بہت کم چانسز ہوتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایسے وقت میں اعضاء بھی نکالتے ہوں۔ کیونکہ ایسے کیسز رپورٹ ہوئے ہیں کہ ورثا کو لاش ملی مگر ایسی حالت میں کہ انکے اعضاء غائب تھے۔ جیسے میں نے بتایا کہ ان کی کوئی پوچھ گوچ نہیں ہوتی، افسر کو تحفظ حاصل ہوتا ہے اور یہ قیدی بچارے لاپتہ افراد ہوتے ہیں جن کو کوئی آئینی یا قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ جنہوں نے اٹھایا ہے وہ اس ملک میں اتنے طاقتور ہے کہ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں اور خود تو بڑی بے شرمی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ لاپتہ افراد نہیں تو اب کونسا مجسٹریٹ ان پر چھاپہ لگائے گا یا کونسے تھانے میں ان کے خلاف مقدمہ درج ہوگا یا پھر کون سا ادارہ ان کے خلاف تفتیش کرے گا؟

اور پھر سب سے بڑا ٹارچر تو ان کے پاس قید ہونا ہے۔ آپ خود کو ایک دن کیلئے ایک بند کمرے میں بند کر لیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک دن تو کیا ایک گھنٹہ بھی گزارنا بہت مشکل کام ہے اور پھر یہ تو نہ ہفتے کی بات ہے نہ مہینے کی اور نہ سال، بلکے کئی کئی سال بند پڑے رہتے ہیں اور اس

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

طرح وہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہونے لگتے ہیں۔ (آج کے کرونا وائرس کی وجہ سے اس تکلیف کا ذرہ اندازہ تو ہوا ہوگا)۔۔

جب ملٹری کورٹس نے سزائیں دیں، تو اُن سب میں کہا گیا کہ ملزمان نے اقبالِ جرم کیا ہے یعنی کوئی ثبوت نہیں صرف اقبال جرم۔ مگر (آئی ایس پی آر) یہ نہیں بتائے گا کہ انکو کس قسم کے ٹارچر پر سے گزار کر اقبال جرم کروایا گیا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ ٹارچر اگر آصف غفور صاحب یا باجوا صاحب کو دیا جائے تو یقین مانئے پاکستان بننے سے پہلے کہ جرائم بھی اپنے سر لے لیں گے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی نیو یارک ٹائمز میں اسٹوری چھپی ہے کہ بیس سال پہلے کا اقبال جرم کرنے والا مجرم بے گناہ ثابت ہوا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ بیس سال پہلے ایک لڑکی کا ریپ ہوا تھا اور ریپ کرنے والے نے قتل بھی کر دیا تھا۔ جس کو شک کی بنیاد پر پکڑا گیا، اُسے اتنا خوفزدہ کر دیا گیا کہ اس نے اس جرم کو اپنے سر لے لیا۔ حلانکہ ثبوت اس کے خلاف جا رہے تھے جو ڈی این اے (سیمن) سے لی گئی تھی وہ اس کے ڈی این اے کے ساتھ میچ نہیں کرتی تھی. عدالت نے اقبال جرم کی بنیاد پر سزا دے دی، بیس سال بعد پولیس نے اصل مجرم کو پکڑا جس سے ڈی این اے میچ ہوا اور اس نے مانا بھی کہ یہ کام اس نے اکیلے کیا تھا اور جس بندے نے اس کیس میں بیس سال جیل کاٹی تھی، اُس کو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ ماہرین نفسیات کا ماننا ہے کہ اگر آپ ایک بندے کو صرف ایک خاص ماحول میں کچھ مدت تک رکھ لیں تو پھر اس کو اپنے حساب سے (مینوپولیٹ) کر سکتے ہیں اور یہاں تو نہ جانے کیا کیا عذاب نہیں دیے جاتے۔ اس لئے ملٹری کورٹس کے سامنے اقبال جرم کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی اور پشاور ہائی کورٹ نے اس بنیاد پر ان کے فیصلے کالعدم کیے تھے۔

انٹرنمنٹ سینٹرز میں اس طرح سزا یا اس طرح سے اقبال جرم کر لینا ایک طرف، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو نہ تو خود معلوم ہوتا ہے کہ اس پر الزام کیا ہے اور نہ آرمی کو معلوم ہوتا ہے کہ کس جرم میں اُسکو اٹھایا ہے اور وہ سالوں سال پڑے رہتے ہیں کوئی عدالتی نظام تو ہے نہیں کہ کیس کی پیروی ہو رہی ہو یا تاریخیں مل رہی ہوں۔ اس طرح کا ایک واقعہ نیک والی ولد گل میر خان کے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

بیٹے نے سنایا تھا اور میں نے اس کی لائیو ویڈیو بھی کی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے گاؤں کے دیگر لوگوں کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کوئی 26 مہینے کے بعد ایک کرنل تفتیش کیلئے آیا اور کہا کہ تمہارے اوپر کیا کیس ہے میں نے جواب دیا کہ کیس کا تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کرنل نے کہا کہ مجھے بھی نہیں معلوم ہے اور پھر خود تسلیم کیا کہ آپ کو غلطی سے اٹھایا گیا ہے۔ پھر بھی رہائی میں 10 مہینے مزید لگے یعنی خود تو دوسروں پر تنقید کرتے ہیں کہ عدالت بروقت فیصلے نہیں دیتی اسی لیے ملٹری کورٹس چاہیے اور خود کا یہ حال ہے۔ پھر اسی بندے کے بوڑھے والد یعنی نیک والی کو اٹھایا گیا اور اسے 2018 میں ملٹری کورٹ کی طرف سے سزائے موت کی سزا سنائی گئی تھی جس کو پشاور ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا مگر چونکہ حکومت اس پر سپریم کورٹ چلی گئی تو وہ بیچارہ مجھے بتا رہا تھا کہ میں پیشے سے ڈرائیور ہوں، ایک دفعہ تو میری زندگی برباد کر دی اور پھر کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے اب والد کو سزائے موت سنا دی ہے۔ میں اپنے بوڑھے والد کا کیس لڑوں یا اپنے بچوں کو حلال رزق کما کر دوں۔

26، اگست، 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی

نیک والی کے بیٹے کے ساتھ انٹرویو کا لنک

https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=2205143886180847&id=100000557728

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

لینڈ مائنز کے خلاف ہم نے کیا کیا اور اسکی ہمیں کیا سزا ملی؟

جب 2012 اور 2013 میں لوگ آپریشن راہ نجات کے بعد واپس اپنے علاقوں کو جانے لگے تو سب کو پتہ تھا کہ کئی سالوں پر محیط جنگ میں، نہ ان کے گھر رہے ہوں گے اور نہ ہی ان کے کھیت اور باغات۔ مگر اپنے آبائی علاقوں میں جانے کی امیدیں کہ بس اب جنگ کے دن گئے۔ اب پر امن طریقے سے اپنی زندگی پھر سے شروع کریں گے۔ جب واپس گئے تو ان کی توقعات کے مطابق نہ تو گھر تھے، نا ہی کھیت اور بازار، مگر جس چیز کا اضافہ ہوا تھا، وہ تھے لینڈ مائنز جو آرمی نے فصل کی طرح بوئے تھے اگرچہ وہ ان سے انکار کرتے ہیں اور مختلف تاویلیں پیش کرتے تھے ان کی بات کیوں دروغ گوئی اور غلط بیانی پر مبنی ہے اس پر بعد میں بات کرتے ہیں

لینڈ مائنز کے شکار کو آرمی کی طرف سے مدد تو دور کی بات ہے، اگر بغیر تشدد کے ان کو ڈیرہ اسمعیل خان اپنی مدد آپ کے تحت جانے دیا جائے، یہ بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ اکثر اوقات اہل علاقہ کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا جہاں کوئی لینڈ مائنز کا شکار ہو جاتا گویا یہ بھی ان کی غلطی تھی کہ لینڈ مائن کا شکار ہوا ہی کیوں ہے۔ لینڈ مائنز سے متاثرہ لوگ بہت ہی غریب ہوتے ہیں، وزیرستان سے بار بار نقل مکانی کرنے کے بعد ہر اس شخص نے لوکل علاقوں میں خود کے لئے رہائش کا مستقل بندوبست کر لیا ہے جو تھوڑا بہت سرمایہ رکھتا تھا۔ اب جو لوگ کرائے کے مکانوں یا گھر خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ ہی سارا سال وزیرستان میں رہتے ہیں اور پھر لینڈ مائنز کا شکار بھی یہی غریب لوگ بنتے ہیں۔ اکثر لوگ مویشی پالنے کے کاروبار سے منسلک ہوتے ہیں اس طرح مویشی بھی لاتعداد ان لینڈ مائنز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ خدا ہر مجبور اور مظلوم کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا بنا لیتا ہے۔ لینڈ مائنز کے شکار لوگوں کیلئے بھی ایک نوجوان سہارا بن گیا تھا۔ یہ یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ تھا۔ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی وہ دوسرے ایسے مظلوموں کی مدد کرتا تھا جب بھی کوئی وکٹم ہسپتال پہنچتا تو یہ ان کی مدد کے لیے پہنچ جاتا۔ پہلی فرصت میں تو ان کو خون کی ضرورت

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہوتی، ٹرائبل سٹوڈنٹس کا صدر بھی تھا اسی لیے اس کی کال دینے پر طلبہ خون دینے کے لئے حاضر ہو جاتے تھے۔ اب دوسرے مرحلے میں ان مظلوموں کی مالی مدد کرنا ہوتی تھی ہسپتالوں میں صرف دوائی پر اتنا خرچہ آتا کہ وہ کئی سے بھی اتنے پیسے جمع کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتے۔ یہ سٹوڈنٹ جا کر مخیر افراد کو لے آتا اور ان سے ان وکٹمز کی مالی مدد کرواتا، پولیٹیکل انتظامیہ سے بھی انکی مدد کرواتا مگر اس سے بھی خرچ پورا نہ ہوتا۔ پھر یونیورسٹی کے طالبعلم اپنے جیب خرچ سے چندہ جمع کرتے۔ یہ سٹوڈنٹ جوان مظلوموں کے لیے بھکاری بن جاتا تھا اس کی خودی کی خوداری کا حال یہ تھا کہ ایک دفعہ اس کے خاندان نے اسے ایکٹویزم کی پاداش میں اس کا جیب خرچ بند کر دیا کیونکہ اس کے خاندان والوں کو دھمکیاں مل رہی تھیں کہ یہ لینڈ مائنز وکٹمز کی مدد کر رہا ہے اور سوشل میڈیا پر بھی اس حوالے سے تحریک چلا رہا ہے جس سے انٹرنیشنل میڈیا کی نظر یہاں مبذول ہو رہی ہے، اگر اس کو نہیں روکا تو نتائج ٹھیک نہ ہوں گے۔ مگر ان واقعات پر ایک باشعور انسان کیسے چھپ رہ سکتا ہے۔ جب اس سے دال نہیں گلی تو انہوں نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا مگر یہ خودار تین دن بھوکا رہتا مگر کسی سے نہ کہتا کہ میرے پاس پیسے نہیں، کوئی مدد کرے۔ اس کا ایک دوست جب تین دن میں کوئی کھانے کا پروگرام کرتا تو اُسے بھی ضرور بلاتا اگرچہ اُس کے دوست کو معلوم نہ ہوتا کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ یہ سٹوڈنٹ کوئی اور نہیں، آج کے پشتون تحفظ موومنٹ کے مشر منظور پشتین تھے۔ افسوس بعد میں میڈیا نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ منظور پشتین اس وقت کہاں تھا اور اُس وقت کہاں؟ منظور تھا اور اپنے لٹے پھٹے لوگوں کی مدد کر رہا تھا مگر یہ میڈیا اس وقت پاک فوج کے کامیاب فضائی حملوں کے گُن گا رہا تھا کہ جس میں اکثریت بچے اور خواتین ماری جاتی تھیں۔

جہاں تک لینڈ مائنز وکٹمز کی بات ہے تو ہمارے پاس کئی کا ڈیٹا موجود تھا مگر 2018 میں ہماری آواز دور دور تک سنائی دی تو پاک فوج نے اس سے متعلق کچھ یوں تاویلیں پیش کیں کہ

یہ طالبان کی بچائے ہوئے ہیں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

لینڈ مائنز روس دور کے پڑے ہوئے ہیں

اس کی صفائی کر رہے ہیں مگر ٹائم لگے گا

چوتھے نمبر پر اگرچہ افیشلی نہیں مگر سوشل میڈیا پر اپنے فیک اکاؤنٹس سے یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جو شکار ہوئے ہیں وہ خود لینڈ مائنز لگاتے ہوئے شکار ہوئے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ بڑی بے حسی اور بے شرمی سے کرتے تھے اگرچہ ہم نے جو ویڈیوز ریکارڈ کر کے دیں وہ سارے تقریباً بچے تھے۔ چار سال اور پانچ سال کے بچے اور بچیاں کیا یہ لینڈ مائنز لگا سکتے ہیں؟ اسکا شکار ہونے والوں میں سے بہت سی خواتین بھی ہیں کیا وہ بھی لینڈ مائنز لگا رہی تھیں؟ اس طرح لوگوں کے بے شمار مویشی بھی اس کا شکار ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی لینڈ مائنز لگا رہے تھے؟ اور یہ کہنا کہ طالبان نے لگائے ہیں یہ مان بھی لیا جائے تو صاف کرنا کس کی زمہ داری ہے۔ اس پر میں اپنا تجربہ بیان کر دیتا ہوں۔ 2017 میں ہمارے علاقے لدھا میں ہم کو جانے کی اجازت ملی، میری فیملی کوئی آٹھ سال بعد اپنے علاقے گئی۔ ہمارے گاؤں میں بہت سے توپ خانے کے گولے پڑے تھے اس کے علاوہ مارٹر گولے اور دیگر بارودی مواد پڑا تھا۔ ہم نے دو دفعہ باقاعدہ آرمی کو رپورٹ کیا کہ یہ چیزیں ہمارے ہاں پڑی ہیں ان کا کچھ کریں، انہوں نے کہا آرمی کی انجینئرنگ یونٹ آئے گی۔ اس کو پورا سال گزر گیا مگر کوئی انجینئرنگ ٹیم نہیں آئی۔ میں نے جب اس کی ویڈیوز سوشل میڈیا پر دیں تو آرمی میرے گھر پہنچ گئی اور میرے گھر والوں کو دھمکیاں دی گئیں۔ کچھ عرصے کے لئے تو میرے وزیرستان آنے پر بھی پابندی لگ گئی یعنی یہ سب تو کر سکتے تھے لیکن قسم کھائی تھی کہ صاف نہیں کریں گے۔ پھر یہ کہنا کہ یہ روس دور کے پڑے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اتنے سالوں سے خاموش پڑے تھے اور جب آپریشن کے بعد لوگ واپس گئے تو اچانک سے پھٹنا شروع ہو گئے ورنہ یہ بات تو بہت مضحکہ خیز ہے کیونکہ روس افغانستان میں آیا تھا، اس کے لینڈ مائنز کیسے یہاں پہنچے۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ قبائلی علاقوں سے لینڈ مائنز صاف کئے جائیں اور جو معذور ہوئے ہیں یا شہید ہو گئے ہیں۔ ان کو فوری طور پر مدد فراہم

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیا جائے. اس سے ہماری مراد ایک باقاعدہ پالیسی اور سسٹم تھا کہ اس کے شکار ہونے والے افراد کو ریاست اپنی ذمہ داری مانے۔ 2017 میں ہم ڈی آئی خان میں شمکئی جنوبی وزیرستان میں ہونے والے آرمی کے تشدد کے خلاف احتجاج کر رہے تھے تو اس وقت ڈی آئی خان کے آئی ایس آئی کے انچارج نے ہمیں مزاکرات کی دعوت دی۔ تب یہ مسلہ ہم نے انکے سامنے بھی ڈسکس کیا اور جب بات کمپنسیشن کی آئی اور میں نے پنجاب میں آئل ٹینکر کے تیل میں آگ لگنے سے مرنے والوں کو پچیس پچیس لاکھ امداد دینے کی بات کی تو اس کرنل نے کہا کہ "میں اس پر ایک باقاعدہ رپورٹ دے چکا ہوں کہ پنجاب میں اُن چوروں کو اتنا معاوضہ دیا جاتا ہے اور یہاں لینڈ مائنز سے مرنے یا معذور ہونے والوں کو کچھ بھی معاوضہ نہیں دیا جاتا چاہے وہ لینڈ مائنز کسی نے بھی لگائے ہوں مگر شکار تو معصوم لوگ ہے"۔ یہ بڑی افسوس کی بات ہے کہ کسی کو بھی معاوضہ نہیں دیا گیا بلکہ ریاست بڑی مجرمانہ طریقے سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے یعنی 2018 پی ٹی ایم دھرنے کے بعد پاک فوج وکٹم کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور سی ایم ایچ میں داخل کر دیتی ہے تاکہ اس طرح کسی کو نظر نہ آئے۔ ہم اس پر بھی خوش ہیں کہ علاج تو ہو سکے گا لیکن لینڈ مائنز کی صفائی اور شکار ہونے والوں کو معاوضہ بدستور مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اصل میں ریاست اس کو اسلئے ماننا نہیں چاہتی کہ لینڈ مائینز ریاست پاکستان نے لگائے ہیں کیونکہ اس سے وار کرائمز کا انٹرنیشنل کیس بنتا ہے۔

ہم نے اپنا ہوم ورک پورا کیا ہے ہمارے پاس بہت سا ڈیٹا موجود تھا مگر پھر بھی ایک دفعہ ان کے انٹرویوز لینا ضروری سمجھا تو ہم نے ان میں سے چند کے انٹرویوز لئے، جہاں ایکسپلوزیو میٹریل پڑا ہوا تھا ان کی بھی وڈیوز بنائی افسوس اس حوالے سے میری ایک ویڈیو کو میرے کورٹ میں ضمانت پر بحث کے دوران پیش کیا گیا کہ جس ویڈیو میں میں بتا رہا ہوں کہ اگر اس طرح کی چیزیں کسی کو نظر آئیں تو ہاتھ مت لگائیں اور چھڑنے سے گریز کریں اور پاک فوج کو رپورٹ کریں۔ جج صاحبہ نے وہ وڈیو دیکھ کر بہت حیرانی کا اظہار کیا اور میری ضمانت کینسل کر دی۔ مگر نہ تو اس نے اور نہ ہی پیش

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کرنے والوں نے میری باتوں پر کان دھرے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں اور یہ تو کچھ بھی نہیں بلکہ آرمی نے 2018 میں جنوبی وزیرستان کے پولیٹیکل ایجنٹ کو میرے خلاف مقدمہ درج کرنے کی درخواست دی تھی۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک رات مجھے واٹس ایپ پر میسج آیا کہ مکین سے حوالدار فلاں (نام بھول چکا ہوں) بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ تنگی بدینزائی جو میرا علاقہ ہے، میں پڑا اکسپلوزیو میٹریل بتادیں گے، ہم اٹھانے آجائیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ کام تو بہت زبردست کروگے۔ میں ابھی ڈیرہ اسماعیل خان میں ہوں آپ لوگ وہاں جاؤ کسی سے بھی پتہ کرلو گے وہ وہاں پڑی ہوئی ایکسپلوزیو میٹریل بتادیں گے. اس نے کہا کسی کو اگر بتادوگے تو ہم اس کے پاس چلے جائیں گے. میں نے کہا کہ ٹیلی فون کی سہولت صرف آپ کے پاس ہے۔ میں کسی کو کیسے بتاؤں گا ہاں میرا بھائی وہاں ہے اور فلاں گاؤں میں ہے اگر اس کے پاس چلے گئے تو وہ بھی بتا سکتا ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے اگر وہ ملا تو ٹھیک نہیں تو کسی اور سے پوچھ لیں گے۔ میں نے کہا بہت بہتر، بتائیں گے تو سبھی لوگ۔

اگلے روز ایک مقامی فیس بک نیوز پیج سے خبر چلائی گئی کہ جہاں ٹیم گئی تھی وہاں دھماکہ ہوا ہے جس میں تین فوجی جاں بحق ہوئے ہیں اور کئی زخمی ہوئے ہیں۔ میں دو دن تک آئی ایس پی آر کے پریس ریلیز کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی پریس ریلیز جاری نہیں ہوا حالانکہ اس دن ورکنگ باؤنڈری پر بھارت کی جانب سے فائرنگ ہوئی تھی جس میں ایک شخص زخمی ہوا تھا، آئی ایس پی آر نے اس پر پریس ریلیز جاری کی تھی اور یہاں ان کے بقول تین فوجی شہید اور کئی زخمی ہوئے تھے اور کوئی پریس ریلیز جاری نہیں ہوا تھا، نہ ہی کسی ٹی وی پر چلا اور نہ مرنے والوں کی لاشیں کسی نے دیکھی، میں نے سوچا دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بہر حال انہوں نے میرے علاقے سے چار بندے بھی اٹھا لیے تھے۔ اُن دِنوں وچہ خواڑا جنوبی وزیرستان میں بھی تشدد ہوا تھا اور وہاں سے بھی بندے لے کر گئے تھے۔ ہم نے ان کی رہائی کے لئے سراروغہ میں احتجاجی دھرنے کا اعلان کر دیا، انتظامیہ فوری ایکشن میں آئی، مذاکرات ہوئے اور بندوں کی رہائی کے لئے وقت مانگا گیا۔ بالآخر بندے کوئی ایک مہینے بعد رہا ہوئے، جب ان میں سے دو بندوں سے میں ملا تو پتہ چلا کہ آرمی کی ٹیم آئی اور ہم

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

دونوں کو اپنے ساتھ لے لیا اور جہاں بھی توپ خانے کے گولے گرے پڑے تھے اگرچہ وہ بہت وزنی ہوتے ہیں، سارے ہم سے اٹھوائے گئے۔ پھر ایک جگہ جمع کروا کر انہوں نے حکم دیا کہ سب اپنے گھروں میں گھس جاؤ ہم دھماکا کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد زوردار دھماکہ ہوا اور پھر ہم ہی کو گرفتار کر کے لے گئے، ایک بندے سے اُسکی گائے گم ہو گئی تھی وہ بھی آرہا تھا اس کو بھی پکڑ لیا ایک دوسرا بندہ موٹر سائیکل پر آرہا تھا اسکو بھی دبوچ لیا۔ ہوا کیا تھا آج تک معمہ ہے کہ کوئی اس میں شہید ہوا بھی تھا یا نہیں؟ اگر ہوا تھا تو لاش کہاں گئی، آئی ایس پی آر نے خبر کیوں نہ دی، میڈیا پر خبر کیوں نہ چلی اور جب انہوں نے خود کہا کہ گھروں میں چلے جاؤ ہم دھماکہ کر رہے ہیں تو پھر بندے کیسے شہید ہوئے کہیں ایسا تو نہیں ہوا تھا کہ جو مواد انھوں نے جمع کیا تھا اس کو بلاسٹ کرتے ہوئے خود ہی اس کا شکار ہو گئے تھے یا پھر یہ سب کچھ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کیا گیا تھا کہ میں اس کام سے رک جاتا؟

یہ آخری سوال زیادہ نزدیک بر مبنی حق تھا۔ جب یہ صورتِ حال ہو کہ کوئی سچے دل سے انتہائی انسانیت سوز مسئلے کا تدارک کرنا چاہتا ہو، اس حوالے سے اتھارٹیز کی مدد کر رہا ہو کیونکہ بالآخر مسئلہ تو ہمارے لوگوں کا ہے، بچے تو ہمارے معذور یا شہید ہو رہے ہیں مگر یہاں اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کے بجائے الٹا اس بندے پر مقدمہ درج کرنے کے لیے درخواست دی جا رہی تھی جو اس پر کام کر رہا تھا۔

جب حال یہ ہو وہاں صفائی کیا ہونی تھی بلکہ وکٹمز میں اضافہ ہو سکتا تھا اور پھر وہی ہوا کہ چند دن بعد علاقہ مالک میلہ میں دو کم عمر لڑکے لینڈ مائن کا شکار ہوئے۔ ایک لڑکے کی ٹانگ کٹ گئی تھی مگر اس نے اتنی ہمت کی تھی کہ گھر واپس آیا، دوسرے لڑکے کو ڈھونڈنے کے لیے فوج کو کہا گیا مگر انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ لوگ خود ہی جنگل میں گھسے، لڑکا نہیں ملا پھر کافی تلاش کے بعد جب اندھیرا چھانے لگا تو کہیں سے جنگلی کتوں کی لڑائی کی آواز سنائی دی لوگ جب وہاں پہنچے تو بچے کی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ادھی لاش جنگلی کتے کھا چکے تھے اور انتہائی بری حالت میں تھا۔ اس کی ویڈیو اور تصویریں سوشل میڈیا پر ہم نے دیں۔ کیا ایسی بھیانک تصویر کوئی برما میں بھی ڈھونڈ سکتا ہے اور یہ تو ہونا ہی تھا، آرمی کو اس سے فرصت ملے تو وہ کچھ کرے کہ کس طرح پی ٹی ایم کی آواز دبائی جائے۔

اب بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پوری ایک پالیسی اس حوالے سے واضح کرے اور وہ معاوضہ مقرر کرے جو ملک کے باقی شہریوں یا پنجاب میں بقول آئی ایس آئی کے کرنل کہ تیل کے چوروں کو دیا گیا۔ آرمی یا پولیٹکل انتظامیہ کی قلیل مدد سے کام نہیں چلے گا مگر سب سے ضروری بات صفائی کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ مقدموں سے کام نہیں چلے گا کیونکہ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جیل ہے، تشدد ہے۔ ہم اپنے وطن اور قوم کو دیکھتے ہیں اور ان کے لئے ہم کبھی بھی آپ کو چھین سے بیٹھنے نہیں دیں گے

27اگست 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

عام عوام پر تشدد اور پی ٹی ایم

(پہلی قسط)

فروری 2018 کے آخری دنوں کی بات ہے میں ایک خاندان کے پاس گیا جس کے بچے کو فوج کے ٹرانسفارمر سے کرنٹ لگا تھا جس سے اس کا ہاتھ ضائع ہو گیا تھا۔ فوج نے اپنے لئے ٹرانسفارمر گاؤں کے بیچ راستے میں لگایا تھا۔ لوگوں نے شکایت بھی کی تھی مگر نہ اس وقت اور نہ اس کے بعد، جب بچے کو کرنٹ لگا انہوں نے ٹرانسفارمر وہاں سے ہٹایا تھا۔ جب میں اس کے گھر گیا تو وہاں ایک بندہ ملاقات کے لئے آیا اور اس نے کہا کہ ہم پر بہت ظلم ہوا ہے، ملاقات کی بہت کوشش کی اور آج یہاں مجھے ملے ہو، میں چاہتا ہوں آپ میرے گھر آئیں۔ میں نے کہا اب تو میں کہیں جا رہا ہوں لیکن وعدہ کرتا ہوں تمہارے گھر آکر ساری کہانی سنوں گا۔ اس نے موبائل نمبر اور گھر کا پتہ دیا۔ اس وقت میرے امتحانات بھی جاری تھے، اپنا پیپر دینے کے بعد اس کے گھر کے لیے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوا، ڈیرہ اسمیل خان شہر سے کوئی 40 کلومیٹر دور رمک میں ان کا گھر تھا۔ جب ان کے گھر پہنچے تو ہم کو اس نے اپنے گھر میں بیٹھانے کے بجائے پڑوسی کے گھر میں بیٹھا دیا۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پھر اس نے اپنی کہانی سنائی۔ اس نے کہا کہ میں دبئی میں کام کرتا تھا میرے بڑے بھائی عیدار جان کا میر علی شمالی وزیرستان میں ہوٹل تھا جہاں پر وہ اور اس کے چار بیٹے حلال روزی کماتے تھے جب 2015 میں وہاں آپریشن شروع ہوا تو وہ واپس اپنے گاؤں شکتوئی جنوبی وزیرستان آئے اور وہاں پر اپنے بیٹوں کے لیے علاقے کے پیدل راستے پر ایک ریسٹورنٹ کھول لیا، ریسٹورانٹ کیا تھا دو تمبو لگائے تھے جس میں کھانا پکایا جاتا تھا اور مسافر یہاں سے کھانا کھاتے تھے۔ 21 اپریل 2015 کو ہمارے اوپر یہ عذاب نازل ہوا کہ علاقے میں کہیں پر بم بلاسٹ ہوگیا۔ پاک فوج نے راستے میں جس کو بھی پایا اٹھا لیا اس طرح ہمارے بھائی عیدار جان اور اس کے چار بیٹے جو کہ یہی چار ہی تھے، اٹھالئے۔ ان کے ہاتھ باندھ لئے اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں۔ اُس کے بعد اتنا مارتے رہے کہ راستے میں میرے ایک بھتیجے کی موت ہوگئی۔ وہ راستے میں دو دن تک یوں ہی پڑا رہا تھا، جب کرفیو میں تھوڑی نرمی ہوئی تو جہاں پر وہ پڑا تھا وہاں کے گاؤں والوں نے اسے اٹھا کر دفنا دیا تھا۔ انہوں نے تصویر بھی لی تھی جس کو میں فیس بک پر شیئر کر چکا ہوں۔ جسم پر خنجروں کے وار کے لاتعداد نشان تھے۔ ظالموں نے اتنا بھی لحاظ نہ رکھا کہ بندے کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور آنکھوں پر پٹی ہے انہوں نے تو شاید خنجروں کی پریکٹس کرنی تھی۔ ایک بھتیجا شہید ہو چکا تھا جبکہ باقی چار یعنی باپ اور تین بیٹے اب تک لاپتہ ہیں۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ میں دبئی سے واپس آ گیا کیونکہ گھر کے سارے مردوں کو تو لے گئے تھے۔ میں نے ان کو بہت ڈھونڈا مگر ہر در سے ناکامی ہوئی۔ اب یہی محنت مزدوری کرتا ہوں اور اپنے اور بھائی کے خاندان کی کفالت کرتا ہوں۔ بہت دردناک کہانی تھی مگر یہ تو اس کہانی کا صرف ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو تو اس سے بھی زیادہ دردناک تھا۔ پھر وہ دو بچے لایا ایک بچہ اور ایک بچی، کہا کہ یہ میرے بڑے بھتیجے کا بچہ ہے جو ابھی تک لاپتہ ہیں اور یہ اس بھتیجے کی بچی ہے جس کو شہید کر دیا گیا ہے اور یہ دونوں اُس واقعے کی چھ اور سات ماہ بعد پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس اُنکی صرف یہ نشانیاں بچ گئی ہیں۔ میں نے پوچھا ان بچوں کی ماؤں اور دادی کا کیا حال ہے۔ اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ میں نے تم لوگوں کو پڑوسی کے گھر میں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کیوں بیٹھایا۔ آنکھوں سے آنسو کی لڑی بن گئی پھر بتایا کہ میری بھابی اور میرے بھتیجوں کی بیویوں کو معلوم نہیں ہے کہ گھر کے بندے کہاں ہے یہاں تک کہ جو بیوہ ہے اس کو بھی نہیں معلوم۔ بتائیں تو بھی کیا بتائیں۔ بات ایک کی ہوتی تو بتادیتے یہاں تو پورے پانچ بندوں کی بات ہے، بتادیا تو یا تو مر جائیں گی یا پھر پاگل ہو جائیں گی۔ میں اکیلا بندہ ہوں میرے لئے سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ پھر اب تک یہ بات تم نے چھپائی کس طرح۔ اس نے کہا کہ یہ تو ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ فوج نے بندے اٹھالئے تھے جب میں دوبئی سے آیا اور مجھے ساری صورتحال پتہ چلی تو ایک ہفتے بعد میں نے خاندان کے ساتھ مل کر یہ کہانی بنائی کہ ان کو یہ کہہ دیں گے کہ میرے بھائی کو تو آرمی نے اپنے پاس رکھ لیا ہے مگر بیٹوں کو چھوڑ دیا ہے، ساتھ میں یہ شرط لگائی ہے کہ آئندہ یہاں پر نظر نہ آئے ہم نے ان کو فوراً کراچی کیلئے روانہ کر دیا ہے۔ اصل میں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی طویل ہو جائے گی میں سوچ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سال بعد رہا ہو جائیں گے پھر کہانی ان کو پتہ چل ہی جائے گی مگر اب تو تین سال ہونے والے ہیں مگر اب تک کوئی اتا پتا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ زندہ بھی ہیں یا نہیں یا اُس دن ان کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا اب انکو کیسے سنبھالتے ہو؟ کہا، کرتا یہ ہوں کہ جب میری بھابی اپنے بچوں کو یاد کرنے لگتی ہے اور مجھے کہتی ہے کہ میرے بچوں سے بات کرواؤ تو میں اپنے ایک رشتہ دار جو کراچی میں رہتا ہے، اس سے بات کروا لیتا ہوں اور وہ اس کا بیٹا بن کر اس کے ساتھ بات کر لیتا ہے پھر وہ اُس سے پوچھتی ہے کہ بیٹا واپس آ جاؤ، بہت عرصہ ہو گیا تم لوگوں کو دیکھے تو وہ جواب دیتا ہے کہ امی ہم فوراً ہی آ جائیں گے جیسے ہی بابا رہا ہو جائیں گے، نہیں تو امی ہمیں اس طرح خطرہ ہے اور وہ مطمئن ہو جاتی ہے، میں جتنا خرچ ان کو دیتا ہوں وہ یہ کہہ کر دیتا ہوں کہ کراچی سے تمہارے بیٹوں نے بھجوایئے ہیں۔ میں نے پوچھا مگر تم یہ کب تک کرو گے اس نے کہا کہ عالمزیب میں بہت عذاب میں زندگی گزار رہا ہوں، ایک غم سے چور زندگی تو ہے ہی، ساتھ میں خوف بھی ہے۔ خوف ایسا ہے کہ جیسے گھر میں ٹائم بم پڑا ہوا ہو، بس اب پھٹا تو اب پھٹا۔ پوچھا کہ تمہارے بھتیجوں کی بیویوں کا کیا، وہ کیا نہیں پوچھتی؟ اس کے چہرے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پر ایک غمزدہ مسکراہٹ اُبھری، کہا کہ عالم زیب، پشتون بیٹیاں اپنے شوہروں کا کہاں پوچھ سکتی ہیں۔ میری زندگی میں چند بڑے دردناک کہانیوں میں سے ایک سچی کہانی یہ بھی تھی۔ میں نے اس کی لائیو ویڈیو بھی کی اس کا ڈیٹا مختلف ذرائع کے ساتھ شئیر کیا تاکے کوئی سراغ نکلے۔ اس ضمن میں انقلابی موڑ تب آیا جب پاک فوج کے شکتوئی میں تشدد کی ایک ویڈیو سامنے آئی جو خود ایک فوجی نے بنائی تھی۔ وڈیو میں دیکھا جا سکتا ہے کہ بندوں کو پکڑا ہوتا ہے اور انہیں تشدد کا نشانہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ ایک شخص کا پیٹ پھٹا ہوا ہے اور آنتیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ باقیوں کو گھسیٹ رہے ہوتے ہیں، اس میں ایک بندے کو لے آتے ہیں جس کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوتے ہیں اور آنکھوں پر پٹی ہوتی ہے اور ایک فوجی اسے ایک فلائنگ کیک دیتا ہے اور پھر مارنے لگ جاتا ہے ایک دوسرا فوجی اس کے پاس آتا ہے اور پشتو میں پتہ کرتا ہے کہ نام کیا ھے، جواب آتا ہے کہ ابو خان، والد کا نام؟ عباس خان۔ ویڈیو کوئی چار منٹ کی ہے اور آخر میں ویڈیو بنانے والا فوجی خود اپنے کسی سینئر سے کہتا ہے کہ سر یہ تو بے گناہ مارے گئے ہیں۔ ویڈیو میں دکھائی دینے والا ابو خان آج کل بحرین میں ہوتا ہے۔ اُس کو جب ویڈیو دکھائی گئی تو وہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ بالکل میں ہوں اور اُس دن ایسا ایسا ہوا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی گیلامان آسد خیل پھر ابو خان کی انٹرویو لیتا ہے جس میں وہ ساری تفصیل بتا دیتا ہے اور وہ یہ بھی بتاتا ہے، کہ یہ واقعہ 21 اپریل 2015 کو ہوا تھا یعنی جس تاریخ عیدار جان کو اسکے بیٹوں سمیت لے گئے تھے۔ اب اس دن کے تشدد سے متعلق ہمارے پاس ناقابل تردید ثبوت آ چکا تھا یعنی تشدد کی ویڈیو، اس کے ویکٹم کا انٹرویو جو اس سب کا چشم دید گواہ تھا اور اس تشدد کے ایک اور وکٹم فیملی سے میں پہلے ہی انٹرویو لے چکا تھا۔ ابو خان نے سارا واقعہ تفصیل سے بتایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں بحرین سے واپس اپنے وطن گیا تھا اور چھٹیاں گزار کر میرا واپسی کا پروگرام تھا۔ 21 اپریل 2015 کو میں اپنے گھر سے رخصت لے کر جا رہا تھا تو راستے میں پتہ چلا کہ کرفیو ہے۔ میں واپس آ گیا جس دوران فوج ہمارے گاؤں تک آئی۔ ہمارے گاؤں سے مجھ سمیت ایک اور ملک صاحب کو بھی اپنے ساتھ روانہ کیا، کیا دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اور بھی کئی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

بندے پکڑے تھے جو مختلف گاؤں کے تھے۔ ان میں ہر کوئی تشدد سے اتنا بد حال تھا کہ مشکل سے چل رہا تھا اور کچھ مر چکے تھے جس کو گدھوں پر ایسے لاد کر لے کر جا رہے تھے کہ ایک طرف ان کی ٹانگیں لٹکی ہوئی تھیں اور دوسری طرف سر پھر مجھے کہا کہ تم اس بوڑھے شخص کو لے کر جاؤ گے اسے کوئی تین کلومیٹر دور پہاڑی پر موجود، آرمی کے پوسٹ پر لے کر جانا تھا۔ یہ بزرگ شاہین کا والد تھا جو ہمارے نزدیک گاؤں کا نوجوان تھا اور دبئی سے کچھ دن پہلے ہی آیا تھا۔ جب فوج اس کو لے کر جانے لگی تو اس کے بزرگ والد نے کہا کہ یہ مسافر ہے چند دن پہلے آیا ہے اس کی جگہ مجھے لے کر جاؤ مگر جب فوج والے نہیں مانے تو اس نے کہا کہ پھر مجھے بھی ساتھ لے کر جاؤ انہوں نے اس کو بھی روانہ کر دیا۔ میں شاہین کے والد کو تھوڑا لے کر گیا مگر جسم میں اتنی طاقت نہ رہی کہ اور لے کر جاتا مگر فوجی زبردستی کر رہے تھے اور اس کو ہر قیمت پر لے کر جانا تھا۔ اس نے بتایا کہ فوج نے شاہین اور اسکے والد کو قتل کر دیا۔ ویڈیو میں جس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور آنتیں باہر نکلی تھیں وہ شاہین کا والد تھا۔ اس طرح اور بھی بندوں پر انہوں نے وہاں بدترین تشدد کیا اور چند قتل کر دیے تھے اور وہیں ٹریکٹر سے ایک گڑھا کھود کر ان میں سب کو دفنا دیا تھا۔ ہم جو زندہ تھے ان کو وانہ لے گئے۔ وانہ میں بھی تشدد ناقابل بیان ہے پھر میرے گھر والوں نے کافی تگ و دو کے بعد کئی مہینے بعد وہاں سے چھڑالیا جب انہوں نے میرا ویزا، فلائٹ ٹکٹ ثبوت کے طور پر دکھائے۔

ہمارے لئے اتنا کافی تھا کہ ہم اس واقعے کی تہہ تک جاتے اور سارے ثبوت جمع کرتے، اس لئے شکتوئی جانا ضروری تھا۔ ہم نے مشورہ کیا تو 25 جولائی 2018 جو کہ الیکشن کا دن تھا منتخب ہوا۔ شکتوئی میں ایسا گھر نہیں ہے کہ جہاں فوج سے کسی نے نقصان نہیں اٹھایا اور یہ علاقہ ہے بھی بہت پسماندہ اور خطرناک۔ اسی لئے پچیس جولائی کا دن ایسے کام کے لیے بہترین تھا۔ 25 جولائی کو ہم جنوبی وزیرستان کے لئے روانہ ہوئے۔ سراروغہ سے جو روڈ شکتوئی کی طرف جاتا ہے، وہ آدھے راستے تک پکا ہے اور اس کے بعد کچا روڈ ہے۔ اس روڈ پر واقع پہلی چیک پوسٹ پر ہمیں روکا گیا۔ ہمارے ساتھ ایک ساتھی شکتوئی کا رہنے والا تھا وہ موجود تھا۔ وزیرستان سمت کئی قبائلی علاقوں میں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جانے دیا جاتا بس جو پتہ آپ کے شناختی کارڈ پہ ہے صرف وہی تک بندہ جا سکتے ہے۔ الیکشن کے دنوں میں ہمیں لگا کہ شاید یہ پابندی آج کے دن نہ ہو لیکن ہمیں روکا گیا اور شناختی کارڈ چیک کیے گئے۔ ہمارے شناختی کارڈز پر شکتوئی کے پتے نہیں تھے سوائے ایک دوست کے۔ ہمیں کہا گیا کہ تم لوگ نہیں جا سکتے۔ ہم نے کہا کہ ہم دوست ووٹ ڈالنے کے لیے نکلے ہیں، اس کا ووٹ شکتوئی میں ہے، اس کو پہنچا کر پھر ہم اپنے علاقوں میں ووٹ کاسٹ کرنے جائیں گے۔ سپاہی نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن میں پہلے بریگیڈ سے پتہ کروں گا۔ اس نے ہمارے شناختی کارڈ لیے اور جیسے ہی بریگیڈ کو سب سے پہلا نام میر الیا وہاں سے جواب آیا کہ یہ مت چھوڑو۔ اب ہم دوست بھی پریشان ہو گئے کہ یہ کام کرنے کے لئے آج ہی کا دن تھا شاید اس کے بعد کبھی نہ ہو پاتا۔ اس لیے ہم کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی فیصلہ یہ ہوا کہ اس مین روڈ سے مکین کے راستے شمالی وزیرستان میں جائیں گے وہاں سے رزمک، دوسلی اور پھر دوسلی سے ایک پُرخار راستہ شام کی خوبصورت وادی میں سے گزر کر شکتوئی کی طرف جاتا ہے۔ راستہ بہت لمبا تھا اور ہمارے پاس کار تھی جو بار بار کچے راستوں پر نیچے لگتی تھی مگر ہم پر بھی جنون سوار تھا۔ راستے میں کئی جگہ ہمیں روکا گیا اور ہم کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے جب شکتوئی کے نزدیک پہنچے تو پھر سے روکا گیا۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ کیوں جا رہے ہو ہم نے کہا کے ساتھی ووٹ کاسٹ کرنے کے لیے نکلے ہیں باقی سب نے اپنے اپنے علاقوں میں ووٹ کاسٹ کر لیا ہے بس اس کا رہتا ہے، اِدھر اُدھر بہت کیا انہوں نے لیکن اجازت دینا پڑی۔ اس کے بعد بہت سارا راستہ ہم نے ندی نالوں میں سے پیدل کاٹا کیونکہ گاڑی نیچے لگ رہی تھی۔ جب پہنچے تو کوئی ٹائم ضائع کئے بغیر ایک اور گاڑی لی جو ہر قسم کے ڈھلوانوں اور پہاڑوں پر چڑھ جاتی ہے اور سب سے پہلے شاہین کے گھر گئے۔ شاہین کے چچا اور پھوپھی کے بیانات ریکارڈ کیے اور ایک دوسرے بندے کے گھر گئے جس کے بچوں اور ماں کی ویڈیو لی جو اپنے بیٹے کے پیچھے آندھی ہو گئی تھی، ان کو بھی معلوم نہ تھا کہ اس دن ان کے بیٹے کو کہاں لے گئے تھے یا وہی مار کر دفن کر دیا تھا۔ شاہین اور اس کے والد کے بارے میں تو کم از کم اتنا کنفرم تھا کہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ان کے قتل کر کے وہی دفنا دیا تھا، ایک طرح سے یہ ان کی افسوسناک خوش قسمتی تھی۔ واپسی پر ایک اور گاؤں گئے جس سے کچھ دن پہلے نوجوانوں کو اٹھایا گیا تھا۔ ان کے پورے گاؤں والوں کے ساتھ انٹرویو کیا۔ شکتوئی جاکر وہاں لوگوں کے ساتھ بات کر کے اندازہ ہوا کہ اصل میں یہاں انسانوں کی منڈی بنائی گئی ہے جس میں فوجی آکر بندوں کو لے جاتے ہیں۔ کچھ کو قتل کر دیتے ہیں اور کچھ کو غائب کر دیتے ہیں اور آفیسر اس طرح اپنی کارکردگی ظاہر کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے کامیاب آپریشن کیے جس میں اتنے دہشت گردوں کو مقابلے میں قتل کر دیا گیا اور اتنوں کو زندہ گرفتار کر لیا ہے یعنی یہ کام صرف اوپر کی سطح پر نہیں ہے کہ (آئی ایس پی آر) فوج کی جانب سے معصوم عوام کا قتل ایک کامیاب کاروائی بتاتی ہے بلکہ یہی کام نیچے کرنل اور میجر کی سطح پر بھی ہو رہے تھے اور اپنے سینے پر نئے میڈیلز لگانے کے لئے ان کو یہ عوام ملی ہے کیونکہ شکتوئی میں طالبان بھی ہیں اور طالبان اور فوج ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ ہیں کہ جہاں طالبان جاتے ہیں، وہاں فوج نہیں جاتی اور جہاں فوج جاتی ہے وہاں طالبان نہیں جاتے۔ ہم جس گاؤں میں گئے تھے وہاں بتایا گیا کہ سامنے پہاڑ پر موجود گھر میں طالبان ہیں، وہ ان کا دفتر ہے اور آپریشن راہ نجات سمیت کئی آپریشن ہوئے مگر مجال ہے کہ ان کے دفتر کو کچھ ہوا ہو۔ گاؤں والوں نے ہماری بہت منتیں کیں کہ ہم ان کے ہاں مہمان بن جائیں مگر ہم کو خطرات کا پتہ تھا، ہم وہاں سے نکلے تو مغرب کی اذان ہونے لگی۔ ہم ایک دوسرے گاؤں میں آئے اور وہاں پر رات گزاری۔ صبح ابو خان کے والد سے بھی ملے ان سے بھی ساری کہانی سنی اور ریکارڈ کی اس ملک صاحب سے بھی ملے جس کا ابو خان نے ذکر کیا تھا اس نے بتایا کہ جب ہم کو وانہ لے گئے تو میں مرنے کے قریب تھا اور میرا عضو تناسل بہت پھول چکا تھا۔ وہاں ڈاکٹر چیک اپ کیلئے آیا تو بڑے غصے سے فوجیوں کو کہا کہ اس سے تو اچھا تھا کہ تم لوگ قبروں سے مردے بھی اٹھا کر لے آتے۔ یہ تمام ریکارڈنگ کرنے کے بعد ہم واپسی کیلئے روانہ ہوئے اور اس راستے پر سے آئے جس پر آنے سے ہمیں روکا گیا تھا۔ ہم نے اس کی ایک شارٹ مگر جامع ڈاکومنٹری بنائی اور اس کی ابتداء منظور پشتین کے بیان سے کی۔

Scanned with CamScanner

ڈاکومنٹری کو انگریزی کے سب ٹائٹل دیے گئے اور اس کو ایک ناقابل تردید ثبوت کے طور پر سوشل میڈیا پر دے دیا گیا جس کو ہم کسی فورم پر بھی چیلنج کر سکتے ہیں یا دفاع کر سکتے ہیں امید ہے کہ ایک دن ہم عیدار جان اور شاہین سمیت ہزاروں خاندانوں کے لیے انصاف کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے۔ (جاری ہے(

مزکورہ ڈاکومنٹری کا لنک

https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=212883
2897145280&id=100000557728118

عیدار جان کی فیملی کی کہانی بعد میں بی بی سی نے بھی لی

https://www.google.com/amp/s/www.bbc.co.uk/news
/amp/world-asia-48139648

(c) ketabton.com: The Digital Library

عام عوام پر تشدد اور پی ٹی ایم

(دوسری قسط)

اس طرح ایک اور واقعہ بھی سناتا چلوں تاکہ اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ 2017 کے اکتوبر کے آخری دنوں کی بات ہے ہمیں معلوم ہوا کہ سپینکئی وزیرستان میں ایک گڈ طالبان کمانڈر ولی جان کو زمین میں نصب بم کے ذریعے نشانہ بنایا گیا تھا جس میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آرمی نے پورے سپینکئی کے گاؤں کے لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا اور بدترین تشدد کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ وہاں سے نکلنے کی کسی کو اجازت نہ تھی اور نہ ہی وہاں کوئی جا سکتا تھا۔ اس طرح معلومات تک رسائی نہیں ہو رہی تھی پھر ایک دن پتہ چلا کہ گاؤں والوں میں سے ایک، آرمی کے تشدد سے جاں بحق ہوا اور آرمی والوں نے رات کو لاش پہنچائی اور کہا کہ رات ہی رات میں اس کو دفنا دو، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ بچارے گاؤں والوں پر تو ہر کسی پر قیامت ٹوٹی تھی سو انہوں نے خاموشی سے اس لاش کو دفن کر دیا۔ اس طرح دوسرے دن دوسری تلاش دی گئی اور تیسرے دن تیسری لاش۔ جب تین لاشیں ملیں تو بات بھی بالآخر ڈی آئی خان اور ٹانک تک پہنچ گئی۔ ہم نے فوراً مشورے کے لیے میٹنگ بلائی مگر اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے، ٹانک کے پولیٹیکل کمپاؤنڈ میں قبائلی جرگہ ہوا اور اس کا وفد آرمی کے ساتھ مذاکرات کرنے چلا گیا۔ بعد ازاں ہمارے قبیلے کے ایک ریٹائرڈ فوجی بریگیڈئر نے بھی کردار ادا کیا اور پھر خبر آئی کہ باقی ماندہ سب لوگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ 2018 کے یکم فروری کو جب ہم نے اسلام آباد

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

میں دھرنا دیا تو جو تین بندے سپنکئی میں آرمی کے تشدد سے جانبحق ہوئے تھے ان کی تصویریں بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ دھرنے کے دوران فوجی اور سویلین قیادت سے مل کر پی ٹی ایم کے وفد سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ جتنے مسائل ہیں خاص کر لینڈ مائنز، لوگوں پر تشدد اور لاپتہ افراد کے مسلے پر جنوبی اور شمالی وزیرستان کی فوج کی قیادت سے پی ٹی ایم کی قیادت ملاقات کرے اور انکے مسلے حل ہونگے اور بریفنگ دی جائے گی۔ یعنی ان ملاقاتوں کے ڈیٹ بھی فکس ہو گئے تھے۔ جب اسلام آباد دھرنے سے واپس آئے تو کچھ دن بعد میرے ایگزام بھی شروع ہو رہے تھے، میں رات کو بھی اپنا فون بند یا سائیلینٹ نہیں رکھتا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ مجھے کون کال کرتے ہیں اور ان کی مجھ سے بات کتنی ضروری ہے۔ ایک دن عصر کا ٹائم تھا کہ مجھے ایک فون آیا جب اٹینڈ کیا تو خاتون کی آواز سنائی دی پوچھا کہ بیٹا عالم زیب بات کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ اس نے بتایا بیٹا ہمارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ میں نے پوچھا، اللہ خیر کرے کیا ہوا ہے۔ جواب دیا کہ ہمارے گاؤں میں دھماکا ہوا تھا سارے علاقے والوں کو آرمی لے گئی تھی جس میں دو میرے بیٹے بھی تھے ایک اپنے ایک ہاتھ سے معذور ہیں اور دوسرا دبئی سے آیا تھا۔ بیٹا! ہمارے گاؤں کے تین بندوں کو قتل کر دیا گیا ہے اب میرے بیٹوں سمیت چار بندوں کو ابھی تک اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ واقعہ تو مجھے معلوم تھا فوراً پوچھا کہ آپ سپنکئی کی بات کر رہی ہیں۔ اس نے کہا بالکل اسی کی بات کر رہی ہوں۔ میں نے کہا ان کو آرمی نے چھوڑ نہیں دیا تھا اس نے کہا کہ نہیں، چار بندے ان کے پاس ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ گھر میں ہم خواتین رہ گئی، کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، آس پڑوس سے کچھ مل جاتا ہے تو بچوں کو کھلا دیتے ہیں۔ رات میں وہ بھی ڈرتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے حوصلہ دیا اور بتایا کہ میں کل خود آؤنگا۔ یہ خاندان ڈابرہ میں رہتا تھا جو ٹانک سے تقریباً 20 کلومیٹر دور ہے۔ میرا ایک دوست وہاں کا رہنے والا تھا۔ میں نے اسے فوری ہدایت کی کہ اس نمبر پر رابطہ کر کے اس کے گھر پہنچوں اور خود ساری حالت دیکھو اگر ہو سکے تو اماں جی کی ویڈیو بھی بنالو۔ وہ فوراً گھر سے نکلا۔ کوئی دس منٹ میں اس کے گھر موٹر سائیکل پر پہنچ گیا کوئی آدھے گھنٹے کے بعد اس نے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اماں جی کی ویڈیو بھیج دیں۔ دل دہلا دینے والی باتیں کی تھیں میں نے اسے رات تک فیس بک پر پوسٹ کر دیا اور کہا کہ میں کل پیپر دینے کے بعد فوراً اس سے ملنے کے لیے نکل جاؤں گا اگر کوئی اس خاندان کی مالی مدد کرنا چاہے تو وہ کل صبح تک کر سکتا ہے۔ کل تک جب میں فارغ ہوا تو لوگوں نے کوئی ساٹھ ہزار روپے تک اس کی مدد کے لیے بھیج دیئے تھے۔ ٹانک میں میرے ساتھی وحید اور رضوان انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے گھر کا راشن خریدا اور ڈابرہ میں موجود دوست کو اٹھایا جس نے گھر دیکھ لیا تھا۔ جب گھر پہنچے تو واقعی ان کی حالت بہت خراب تھی راشن دیا اور باقی سارے پیسے اماں جی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ رضوان نے اپنے جیب سے بھی دئے اور اس ماں کو یقین دہانی کروائی کہ اللہ نے چاہا تو تمہارے بیٹے تمہارے پاس ہونگیں۔ اس نے بھی سب کے لئے بہت دعائیں دیں۔ اور ہم نے اس کے بیٹوں کی تصویریں لیں۔ بعد میں اس کے دبئی سے آنے والے بیٹے کے دوست نے بھی دبئی سے اس کی وہاں کی تصویریں اور پاسپورٹ کی تصویریں بھیج دیں۔ ان کے لیے سوشل میڈیا پر بھی باقاعدہ کمپین کیا گیا اور جس طرح میں نے بتایا کہ اسلام آباد دھرنے کے بعد فوجی قیادت کے ساتھ ملاقات تہہ تھی، پی ٹی ایم کا وفد ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ ان کو یہ کیس بھی دیا اور تاکید کی کہ ان افراد کا مسئلہ ضرور وہاں اٹھایا جائے۔ جب ملاقات ہوئی انھوں نے اس ایشو پر بات کی تو آرمی کے جنوبی وزیرستان کے (جی او سی) نے بڑے دوٹوک الفاظ میں ان سے کہا تھا کہ ہم ان کو پھانسی دیں گے۔ یہ بات تو انتہائی تکلیف دہ تھی۔ ہم ایک دفعہ پھر سے ان کے گھر گئے۔ ہم نے ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس بارے میں آرمی کے کیا ارادے ہیں۔ ان کے لیے کچھ اور خدا ترس لوگوں نے پیسے دیے تھے، وہ بھی دیے اور ساتھ میں ایک اور ویڈیو بچوں کے ہمراہ بنائی جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ اگر ان کے والد کو کچھ ہوا تو ہم ان خواتین اور بچوں کو آرمی کے وانا کیمپ کے سامنے بیٹھا دیں گے کیونکہ ان کے لئے پھر برابر ہے کہ یہاں اس جھونپڑی میں رہے یا روڈ پر تمہارے کیمپ کے سامنے۔ اس حوالے سے ٹرننگ پوائنٹ کوئی ایک مہینے بعد آیا جب جنوبی وزیرستان میں فوج کے اختیارات ایف سی کو مل رہے تھے اور آئی جی ایف سی کی تعیناتی ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

مجھے ہمارے ایک قبائلی مشر بادشاہی خان نے بلایا، اس نے کہا کہ آئی جی ایف سی سے میری ملاقات ہے۔ کوئی ایسا کام بتاؤ کہ میں اس کے سامنے رکھوں۔ میں نے کہا کام تو بہت ہیں مگر آپ یہ کام لے جائیں۔ پھر میں نے اسے اس تمام کیس کی سٹوری بتادی۔ ان کی ملاقات ہوئی اور آئی جی ایف سی نے بندوں کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ چند دن بعد پھر سے بادشاہی خان محسود نے فون کر کے بتایا کہ بندے رہا ہو رہے ہیں۔ سروکیئی بریگیڈ پر کل حوالے کیے جائیں گے تم میرے ساتھ چلو۔ میں خوشی خوشی تیار ہو گیا اور اگلے روز ہم بریگیڈ چلے گئے۔ ہمارے ساتھ سپینکئ کے مشران بھی تھے، بریگیڈ میں اس بریگیڈئر سے بھی ملاقات ہوئی جس نے یہ سب تشدد کروایا تھا اور وہاں کے مقامی لوگ اُسے عزرائیل کہتے تھے۔ میری ان سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس نے کہا کہ بندے تم تو چھڑوا رہے ہو مگر یہ تھے ملوث۔ میں نے کہا جو بندے مارے گئے آپ کی کسٹڈی میں، کیا وہ بھی ملوث تھے؟ پھر میں نے پوچھا کے چلو یہ بتائیں کہ وہ کیسے مرے تھے اس نے کہا کہ ایک مرگی کے دورے سے مرا، دوسرے نے خودکشی کر لی اور تیسرے پر تھوڑا تشدد ہوا تھا یعنی ایک بندے کے بارے میں صرف اتنا مان رہے تھے کہ اس پر تھوڑا تشدد ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ مرگی سے تو انسان تب مرتا ہے جب وہ کسی پہاڑ پر سے کھود جائے یا آگ میں۔ ویسے ہی کہاں اس دورے سے بندے مرتے ہیں۔ اور کیا اسکی میڈیکل چیک اپ کی گئی تھی کہ وہ کس سے مرا ہے؟ دوسرا بندہ خودکشی کیوں کرے گا؟ اس کا پاس جواب نہیں تھا۔۔ میں نے کہا چلو ایک چیز اور بتائیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اسی گڈ طالبان کمانڈر پر چند مہینے پہلے ایک اور گڈ طالبان کمانڈر نے بہت سخت تشدد کیا تھا کیا، آپ کا شک اس پر نہیں گیا؟ اس نے جواب دیا کہ اس کو میں نے اپنے علاقے پر بین کر دیا ہے میں نے فوراً کہا کہ کیا یہ انصاف ہے کہ آپ اسے صرف علاقے پر بین کریں جسکے یہاں عوام پر اتنا تشدد کریں کہ ان میں تین جان کی بازی ہار جائیں۔ پھر بندے لائے گئے، بندے تین لائے گئے انہوں نے کہا کہ ایک کو اُجالا سینٹر میں چند مہینے رکھیں گے جس میں ان کی فیملی ملاقات کے لئے آسکتی ہے۔ دوسرے دو بندے باپ اور بیٹے تھے اور باپ تو سفید ریش بوڑھا شخص تھا۔ ان کے کاغذات

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پر دستخط بھی میں نے کیے. وہاں ایک کیپٹن نے کہا کہ اس پر بھی پوسٹ کرنا، میں نے کہا کہ شوق سے کروں گا مگر بعد میں بادشاہی خان محسود کو آئی جی ایف سی نے منع کر دیا تھا کہ اس بات کو سوشل میڈیا پر نہ لائے مگر میں نے پھر بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ باقی اس کہانی کا کسی کو پتا نہ چلا جب وہاں سے واپس آرہے تھے تو سپینکئی کے مشران نے کہا کہ ہمارے ساتھ ضرور کھانے کے لئے جاؤ گے، جب گئے تو وہاں سب لوگوں سے بات ہوئی جو ہم سے ملنے آئے تھے انہوں نے بہت ظلم برداشت کیا تھا۔ ایک بوڑھا بابا ملنے آیا جس کو باقاعدہ دو بندے سہارا دے کر لائے تھے، انہوں نے بتایا کہ یہ اس جان بحق ہونے والے نوجوان کا باپ ہے جس کے بارے میں بریگیڈئر بتا رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے مرنے کے بعد فوج نے اس بزرگ کو کئی دن تک بند کیا، اِسے کہہ رہے تھے کہ تمہارے بیٹے نے تمہاری وجہ سے خودکشی کی ہے، وہ تم سے تنگ تھا یعنی اگر اپنے باپ سے تنگ تھا تو اتنی عمر میں خودکشی نہیں کر رہا تھا اب جب آرمی کی کسٹڈی میں تھا تو اپنے باپ کی وجہ سے خودکشی کر لی تب ہم پر یہ راز بھی کھلا کہ بریگیڈئر نے دراصل خود سے الزام ہٹانے کے لیے یہ کوشش کی تھی کہ ان چار بندوں کو پھانسی لگے تاکہ ان سے ان تین بندوں کے قتل کا داغ دھویا جاسکے کہ ہم نے اصل مجرمان پکڑ لئے اور اس اثنا میں باقی تین جان سے ہاتھ دو بیٹھے۔

اس طرح لوگوں پر تشدد کے بے شمار واقعات ہوئے ہیں، فوج نے اس دعوے کے بعد کہ انہوں نے علاقہ کلئیر کر لیا ہے، جب لوگ آپریشن راہ نجات میں اتنی قربانی دینے کے بعد واپس گئے تو کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کے بعد لوگوں پر تشدد معمول بن چکا ہے۔ لگتا ایسا ہے کہ جیسے یہ باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش اور منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے تاکہ لوگوں کو جتنا ذلیل کیا جاسکتا ہے تو کیا جائے، جیسے شمکئی میں ہوا کہ گھروں سے خواتین اور مرد دونوں کو نکالتے اور خواتین کے سامنے ان کے مردوں پر تشدد کرتے۔ اس میں ایک فیملی کی لائیو ویڈیو منظور پشتین نے کی تھی جس میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا جو بیمار بھی ہوتا ہے اس کو اپنی ماں کے سامنے مارتے ہیں اور ان کا بیٹا دم توڑ دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس کی ماں بعد میں پاگل ہو جاتی ہے اور گھر والوں کو مجبوراً زنجیریں ڈالنا پڑتی ہیں۔ کچھ مہینوں بعد وہ بھی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جاتی ہے اور لوگوں کو اس بات پر تشدد کا نشانہ بنانا کہ انہوں نے طالبان کو دکان سے سودا دیا یا کھانا دیا جب فوج نے اتنے سالوں کے آپریشن کے بعد اور لوگوں کی تباہی کرنے کے بعد بھی ان کو ختم نہیں کیا اور عوام کی حالت یہ ہے کہ بے چاروں کے پاس جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لیے کوئی اوزار نہیں وہ طالبان کو سودا نہ دینے کا کیسے کہیں گے۔

اس طرح کا ایک واقعہ سپینہ میلا میں ہوا تھا، مجھے وہاں کے لوگوں نے بلایا کیونکہ وہاں نہ صرف لوگوں پر تشدد کیا گیا تھا بلکہ علاقے کے دوکانداروں کو بھی لے کر گئے تھے۔ علاقہ مکینوں نے مجھے بتایا کہ جب مجبوراً طالبان کو دکان سے سودا سلف دو یا کھانا دو تو فوج کو فوراً پتہ چل جاتا ہے اور وہ ہمیں نہیں چھوڑتی اگر فوج کو کہیں کہ بھائی یہاں پر طالبان ہے تو طالبان کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ ہمیں ذبح کرنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں، نہ وہ فوج کو کچھ کہتے ہیں نہ فوج ان کو، بس درمیان میں ہم کو پسا جارہا ہے۔ میں سام بریگیڈ کے کرنل سے ملا، اُسے میں نے یہی بات کی کہ آپ ایک دفعہ خود ایمان داری سے سوچیں اور بتائیں کہ اگر آپ کوئی دکاندار ہو آپ کے پاس چند طالبان اسلحے کے ساتھ آ جاتے ہیں کیا آپ اس کو سودا نہیں دیں گے؟ اس نے کہا میں دوں گا۔ میں نے کہا پھر آپ ان دکانداروں کی مجبوری کو کیوں نہیں سمجھتے۔ طالبان سے لڑنے کا کام آپ کا ہے، ان کا نہیں ہے یہ سودا نہیں دیں گے تو وہ زبردستی چھین لیں گے۔ اُن کے لیے کون سا مشکل ہے۔ افیسر اچھا انسان تھا اس نے دوکانداروں کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ حال ہی میں جب آرمی نے مہمند اور شمالی وزیرستان میں عوام پر تشدد کیا، جب عوام مجبور ہو کر سڑکوں پر آئی تو بڑی بے دردی سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہاں جیل میں مجھے خڑ کمر کے واقعے کی خبر ایک منشی قیدی نے دی۔ اس نے بتایا کہ تمہاری تنظیم نے فوج پر حملہ کر دیا ہے جس میں آپکے 15 لوگ جاں بحق ہوئے ہیں۔ مجھ پر جو گزری وہ مجھے پتہ ہے کیونکہ اندازہ ہو گیا کہ اصل میں ہوا کیا ہو گا۔ ریاست نے بڑی بے شرمی سے الزام الٹا پی ٹی ایم پر لگایا کہ انہوں نے فوج کے پوسٹ پر حملہ کیا تھا۔ ہمارے دو

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایم این ایز علی وزیر اور محسن دواڑ کو اس الزام میں زندان میں ڈال دیا گیا ہے۔ کیا حملہ ایسا ہوتا ہے کہ حملہ آور درجنوں کے حساب سے قتل اور زخمی ہو جائے اور جس پر حملہ کیا گیا تھا ان کو خراش تک نہیں آئی مگر اس سے دنیا کو بے وقوف نہیں بنایا سکتا۔ اس کے چند دن بعد جب طالبان نے فوج کی گاڑی کو نشانہ بنایا تو سارے اہلکار شہید ہوئے کیوں کہ حملہ آور طالبان تھے۔ یہاں درجنوں کو شہید کیا گیا اور الزام بھی انہی پر لگا دیا گیا اور انہوں نے حملہ کیا تھا۔

جناب والا ہمارے پاس پہلے ہی سے احساس محرومیاں ہیں مگر کیا ہم اس احساس محرومی کے متحمل ہو سکتے ہیں کہ کیونکہ ہمارے پاس اسلحہ نہیں تھا اور ہمارا راستہ عدم تشدد کا ہے اور ہم پر امن طریقے سے احتجاج ریکارڈ کر رہے تھے تو ہمارے ساتھ یہ کچھ ہوا اگر ہمارے پاس بھی اسلحہ ہوتا تو شاید کوئی ایسے بے دردی سے ہم پر گولیاں نہ برساتا۔ ذرا سوچیئے کہ ریاست اسکی متحمل ہو سکتی ہے؟

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

چیک پوسٹ اور تضحیک آمیز رویہ

قبائلی علاقوں سمیت تمام پختونخوا میں لوگوں کے ساتھ چیک پوسٹ پر تضحیک آمیز رویہ اور ساتھ میں ان پر تشدد نے لوگوں کے اذہان میں یہ بات پوری طرح راسخ کر دی ہے کہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ان چیک پوسٹوں پر جانی مالی نقصان اٹھانا پڑے گا یا عزت پر کوئی حرف آئے گا۔ پشتونخوا کی عوام اس وجہ سے سخت عدم تحفظ کا شکار ہے۔ چیک پوسٹ پر کھڑے فوجی پنجاب کے کسی ضلع سے آئے ہوتے ہیں اور ان کو پشتون معاشرے کے رکھ رکھاؤ و معاشرتی اقدار کا نہ تو علم ہوتا ہے۔ لگتا ہے یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے، مجھے سال 2011 کے اسوقت کے آرمی ترجمان اطہر عباس کا وہ بیان یاد ہے کہ اس نے کہا تھا کہ ہم نے وہ روایت توڑ دی ہے کہ یہ علاقے ناقابل تسخیر ہے یعنی پاک فوج ہمیں تسخیر کرنے آئی تھی؟ ان کو اتنا خیال نہ آیا کہ جب وہ ناقابل تسخیر تھے، تب پوری پشتون قوم ان غاصبوں کے خلاف لڑی تھی جب کہ آپ کے لیے تو ہم نے اپنے علاقے خالی کر دیئے، کئی دفعہ نقل مکانی کی شاید یہی وجہ تھی کہ جب لوگ واپس گئے تو ان کے ساتھ فوج کا رویہ ایک فاتح اور مفتوح تھا۔ ان کے چیک پوسٹ ایک کلونیلائزڈ نظام کا حصہ تھے جس میں لوگوں کی عزت نفس کو کچلنے کی کوشش کی گئی، انکی موبیلٹی کو سست کرنے کی کوشش کی گئی۔ دوسری طرف ان چیک پوسٹ پر کھڑے سپاہیوں میں غیر اخلاقی خباثت بھی موجود تھیں۔ کم عمر لڑکوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بچی کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تو علاقے کے لوگوں نے دو اہلکاروں کو دبوچ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے بعد میں مذاکرات ہوئے تو اہلکاروں کو چھوڑ دیا گیا اس سے متعلق پولیٹیکل انتظامیہ کی طرف سے ایک نوٹیفیکیشن بھی جاری ہوا جس کو ہم نے سوشل میڈیا پر بھی دیا۔

چیک پوسٹ کے حوالے سے ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ چیک پوسٹس کے خاتمے کی بات کر رہے ہیں جس سے دہشتگردوں کو معاونت ملے گی۔ یہاں تک کہ ایک ٹی وی چینل نے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

منظور پشتین پر ایک مزاحیہ کلپ بنایا جس میں وہ چند نقاب پوش دہشت گردوں کو برقعے میں چیک پوسٹ پر سے گزارنا چاہتا ہے حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دہشت گرد کبھی بھی اس طرح چیک پوسٹ پر نہیں آئے گا اور یہاں تو اتنے زیادہ چیک پوسٹ تھے کہ بعض اوقات ایک چیک پوسٹ سے دوسرا چیک پوسٹ نظر آتا تھا۔ ایک دفعہ یہاں پر اترو، تلاشی دو اور پھر سامنے دوسرے چیک پوسٹ پھر سے یہ عمل دہراؤ۔ ہماری تحریک سے پہلے ہر 10 کلومیٹر پر ایک یا ایک سے زائد چیک پوسٹ ہوا کرتی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ مثال کے طور پر آپ ڈیرہ اسماعیل خان سے جنوبی وزیرستان علاقہ مکین جاتے ہیں، جو کہ تقریبا 170 کلومیٹر دور ہے، کتنے چیک پوسٹ پر سے گزروگے، کیا ہوگا ذرا ملاحظہ کیجئے۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے ٹانک کے درمیان ایک چیک پوسٹ ہے جسے مانجھی خیل چیک پوسٹ کہتے ہیں کوئی ستر اسی میٹر دور گاڑی کرنی پڑتی ہے، پھر ایک بندہ سارے سواریوں کے شناختی کارڈ اٹھا کر چیک پوسٹ پر لے جائے گا۔ چیک پوسٹ پر بیٹھا ہوا فوجی پوچھے گا کہ کہاں سے آرہے ہو اب کوئی کراچی سے آرہا ہوگا اور کہہ دے کہ ڈیرہ اسماعیل خان سے آرہا ہوں یہ ثابت نہیں ہوگا کہ واقعی وہ سچ بول رہا ہے؟ دوسرا سوال خدمت میں پیش کیا جائے گا کہ کہاں جاؤ گے تو کوئی اگر وانہ جارہا ہو اور کہہ دے کہ میں ٹانک جاؤنگا تو وہ فوجی آپ کے پیچھے تو نہیں آئے گا کہ واقعی ٹانک جارہا ہے کہ نہیں۔ تیسرا سوال سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہوگا کہ کیوں یا کس لئے جارہے ہو؟ اب اگر کوئی دہشتگرد ہے تو ظاہر ہے وہ یہ تو نہیں کہے گا کہ دہشت گردی کرنے جارہا ہوں۔ یہ سب زبانی باتیں ہوگئیں انکوائنٹر کرنا فوجی کی طبیعت پر منحصر ہے۔ پھر فوجی شناختی کارڈ کی تصویریں دیکھے گا اور کہے گا کہ جاؤ۔ اکثر انٹر نہیں کرتے مگر آپ کو وہاں جانا ضرور ہے۔ اکثر اوقات دور سے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں کہ جاؤ۔

مانجھی خیل کے چیک پوسٹ سے گزر کر کوئی بیس کلومیٹر دور کاوڑ چیک پوسٹ آئے گا اس میں بھی یہی پریکٹس دوبارہ کروگے، یہاں قلعہ ہے، مین روڈ پر گاڑیاں نہیں چھوڑتے ایک الگ کچے میں سے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

گاڑیاں گزریں گی۔ یہاں سے کوئی دس کلو میٹر میں منزئی کا مین چیک پوسٹ ہے، سبھی سواریوں کو نیچے اترنا پڑے گا جامہ تلاشی ہو گی ہر کسی کو اپنی انٹری کروانی ہو گی اور پیدل 200 سے 250 میٹر دور کھڑا ہونا ہو گا جب تک گاڑی ڈرائیور اپنے تمام قواعد درج کروائے گا۔ دس کلو میٹر اور جاؤ گے تو جنڈولہ چک پوسٹ آئے گا جو کہ روڈ سے ایک طرف بنائی گئی ہے، گاڑی کو صرف اس کی طرف لے کر جانا ہے آپ فوجیوں کو دیکھو گے وہ آپ کو دیکھیں گے پھر وہ اشارہ کرے گا کہ جاؤ۔ اگر اپنی دیدار کرائے بنا روڈ سے نکل گئے تو آپ پر فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔ان کے پاس جانا اور آنکھیں چار کرنا ضروری ہیں۔ کوئی دس کلو میٹر اور جاؤ گے تو سپینکئی راغزائی کی چیک پوسٹ آئے گی یہاں بھی وہی کاوڑ والی پریکٹس کرنی ہے۔ دس کلو میٹر کے فاصلے پر مرغی بند کا چیک پوسٹ آئے گا وہاں پھر سے سب کو اتارا جاتا ہے اور پیدل 100 سے 150 میٹر چلنا ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے پھر سے کوائف جمع کرانے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ میں یہاں سے گزر رہا تھا جب انٹری کرنے لگا تو فوجی نے کہا کہاں جاؤ گے، میرا دھیان کہیں اور تھا تو لاپروائی میں بولا کہ چغملائی، اُس نے کہا کہ اس کو تو چھوڑ کر آرہے ہو۔ میں نے کہا کہ آگے کونسی جگہ آتی ہے، وہ بولا سراروغہ۔ میں نے کہا سراروغہ لکھ دو۔ اس پر وہ کافی لال پیلا ہوا۔ سراروغہ پر چیک پوسٹ میں گاڑی کے اندر سے ہی سپاہی کو مضحکہ خیز سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں، انٹری کوئی نہیں ہوتی۔ یہاں سے چند کلو میٹر پر موجود مادوم پل پر گاڑی سے اتر کر واک کرنی ہے جہاں پر انٹری ڈرائیور صاحب کریگا۔ اسطرح کچھ اور آگے جاؤ گے تو پھر سے پوسٹ جہاں زبانی کلامی یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ کسی بھی دہشت گردی کے ارادے سے آپ نہیں جا رہے۔ اسطرح دوسلی کا ایک مین چیک پوسٹ آئے گا جہاں پھر سے انٹری ہو گی۔ اسطرح مکین سے پہلے بھی ایک چیک پوسٹ۔ یہ وہ ہیں جو آج کل بھی ہیں ورنہ اس سے پہلے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پیدل زیادہ سفر کیا ہے یا گاڑی میں۔ چیک پوسٹوں پر تعینات فوجیوں کی اپنی مرضی ہے کہ انٹری کریں یا نہ کریں۔ اکثر کو میں نے چرس کے نشے میں دھت بھی دیکھا ہے۔ اب اگر مجھے مکین سے اپنے گھر جانا ہوا تو میرے گاؤں سے پہلے دو چیک پوسٹ آتے ہیں ایک میں صرف شناختی کارڈ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

چیک ہوں گے اور وہی سوال جبکہ دوسرے میں جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیوں جا رہے ہو تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دل کرتا ہے کہ اس کو پکڑ کر اسکے کان میں چیخ چیخ کر کہوں کہ یہ میری زمین ہے، یہ گاؤں میرا ہے۔ میری مرضی کہ میں یہاں کسی بھی وقت کسی بھی مقصد کے لئے آؤں۔ وہ ایک پشتو کا شعر ہے کہ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "میری گلی میں ایک سپاہی کھڑا ہے جو مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ ہم اپنے ہی وطن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے جیسے میں نے شکتوئی کی کہانی بتائی اور اس کے علاوہ تزہیک آمیز رویہ بہت تکلیف دے ہے اور ناقابل برداشت بھی۔ ہم نے وہ مسائل اجاگر کیے جو لوگوں کے دلوں کی آواز تھے شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ بھی بے تحاشا پی ٹی ایم سے محبت کرتے ہیں۔ منظور پشتین کی ٹوپی کو اس حد تک لوگوں نے اپنا لیا کہ اس کے ڈیزائن کے جوتے چادر اور کپڑے بھی جب مارکیٹ میں آتے ہیں تو ہاتھوں ہاتھ بِکتے ہیں مگر یہ آرمی کو کہاں برداشت تھا۔ ان چیک پوسٹوں پر پی ٹی ایم کے ٹوپیوں کو چھیننے لگے۔ ہمارے اقدار میں ٹوپی پہننا شامل ہے اور ٹوپی کوئی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ایک پشتون اپنی جان دینا گوارہ کر سکتا ھے مگر اپنے سر کی ٹوپی اور چادر پر آنچ نہیں آنے دیتا اور یہ بے وقوف ٹوپیاں چھیننے لگے اور سمجھتے تھے کہ اس سے پی ٹی ایم ختم ہو جائے گی جیسے ہمیں جیلوں میں ڈال کر سمجھتے ہیں کہ اس سے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل تو اپنی جگہ ہی رہیں گے صرف چہرے تبدیل ہو جائیں گے اور کل کو ہماری جگہ کوئی اور بات کریگا۔ عید کے دنوں میں ٹوپیاں چھیننے کے لئے باقاعدہ نئے چیک پوسٹ بنا لیئے جاتے ہیں۔ عید کے دنوں میں تو شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جو اپنے بچوں کو منظور پشتین کی ٹوپی نہیں لے کر دیتا کیونکہ بچے کہاں مانتے ہیں اور یہ ظالم بچوں سے بھی ٹوپی چھین کا ڈرموں میں ڈالتے ہیں۔ عید کے دنوں میں کئی جگہ فوجیوں کے ساتھ عوام کی جھڑپیں بھی اس وجہ سے ہوئی۔ میرے چھوٹے بھتیجوں اور بھانجوں سے بھی ٹوپی چھینی گئی ہے۔ اسطرح کسی کی محبت آپ کسی کے دل سے نہیں اٹھا سکتے ہیں، ہاں نفرت پیدا کر سکتے ہیں اگر تمہیں دیکھ کر لوگوں کو وحشت ہوتی ہے اور آپ اپنے لئے ان کے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

دلوں میں جگہ نہیں بنا پائے تو اس میں قصور آپ کا ہے، اب بچا کچا عزت نفس چیک پوسٹوں پر چھین لیا ہے اور اب بغض پی ٹی ایم میں وہ کام کر رہے ہیں جس کے نتائج بہت سنگین ہونگے۔ تسخیر کا جو عمل شروع کیا گیا تھا وہ ان چیک پوسٹوں اور تشدد سے کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچے گا۔ شاید انہوں نے تاریخ سے یہ سبق نہیں سیکھا کہ اس قوم کو جتنا دباؤ گے اتنا ہی ابھرے گی اور پھر اتنا لڑتی ہے کہ جان چھڑانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنا ایک واقعہ بھی یہاں بیان کرتا چلوں جب سپینہ میلا میں تشدد ہوا تھا اور دکانداروں کو لے کر گئے تھے تو ہم تین ساتھی سام بریگیڈ گئے اور وہاں نزدیک گیٹ پر چیکنگ کے لئے روکا گیا۔ میرے ڈرائیور کے پاس منظور کی ٹوپی تھی کیونکہ ہمیں پتا تھا کہ یہ چھینتے ہیں اسی لیے اس کو ڈش بورڈ کے اندر رکھ لیا تھا تاکہ ان کے ساتھ بدمزگی پیدا نہ ہو۔ چیکنگ کے دوران ڈِش بورڈ کے اندر انکو ٹوپی ملی تو اٹھالی۔ میں نے کہا کہ اس کو واپس رکھ دو، اس نے کہا کہ ہمیں اوپر سے حکم ہے۔ میں نے کہا پہلے تو یہ حکم غیر آئینی اور نامناسب ہے اور یہ میری پراپرٹی ہے نہ تو یہ بم ہے اور نہ کوئی منشیات ہے۔ آپ اس کو نہیں لے سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ نہیں ملے گی۔ میں نے بھی کہا کہ تم تو کیا تمہارا باپ بھی واپس دے گا۔ ایف سی والے وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے معاملہ رفع دفع کرنے کا کہا۔ میں نے کہا تم لوگ مجھے کیوں کہہ رہے ہو میں نے اس کی ٹوپی توڑی چھینی ہے۔ اس نے میری ٹوپی لی ہے۔ شام کی اذانیں ہو رہی تھیں اور اس ٹائم کوئی بریگیڈ میں ملاقات نہیں کر سکتا اور پھر وہاں سے اپنے گاؤں کو پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جاتی اسلیئے میں نے اس سے کہا کہ ٹوپی تو میں ہر قیمت پر لونگا مگر پہلے میں بریگیڈ سے ہو کر آتا ہوں۔ ملاقات کے بعد جب نکلا تو عشاء کی ازان سے کچھ ٹائم رہتا تھا۔ پتہ چلا کہ اُس پوسٹ سے فوجی جا چکے تھے۔ بریگیڈ کے چیک پوسٹ والوں سے کہا کہ انہوں نے میری ٹوپی اٹھائی ہے وہ مجھے چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ جا چکے ہیں اور مجبور ہو کر ایک اور پشتین ٹوپی دے دی جب جانے لگا تو ایک فوجی کہنے لگا کہ اس سے تو ایک کتا بھی کھیل رہا تھا میں نے فوراً کہا کہ اس کتے کا جھوٹا بھی کھالیا کرو اور وہ شرمندہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پاک فوج کے کندھوں پر بوجھ

برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند میں دو سو سال تک حکومت کی اور (روڈیارڈ کپلنگ) کے نظریئے (سفید فام آدمی کا بوجھ) کے تحت اپنے نمک خواروں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کو سمجھاتے رہے کہ اگر یہ گورے ہمارے درمیان سے نکل گئے تو ہم کسی چیز میں بھی ترقی نہیں کر پائیں گے۔ ہمارے اوپر حکومت کرنے کی ان کی ذمہ داری بنتی ہے کیونکے باقی نسلوں کے لوگ اتنے غیر تہذیب یافتہ ہیں کہ کبھی حکومت نہیں کر پائیں گے۔ لوگ بھی ان کی یہ بہت بڑی قربانی اور احسان مانتے تھے اور خود کو دیمک کے سامنے رکھ چھوڑتے تھے تاکہ وہ انہیں اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیں۔ جب برطانیہ کو اپنی کالونی چھوڑنی پڑی تو اس کے مشرقی سپاہی اور بابو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر دیئے گئے، یہ وہ پودے تھے جس کی برطانیہ نے خود آبیاری کی تھی اور تناور درخت بنائے تھے۔ آزادی کے بعد بھی یہی ان کے کلونیلائزیشن کے اصل وارث ہوئے۔ سیاسی ادارے ابھی نوزائیدہ تھے اور اپنے کمزور ترین حالت میں تھے جو جلد ہی سپاہی اور بابو کے ہاتھوں کے مہرے بن گئے۔ سپاہی نے بابو کو بھی رام کر لیا گیا کیونکہ بابوں کے پاس بندوق نہیں تھی۔ پھر وہی ٹیکٹکس اپنائے گئے یعنی سیاسی قیادت ملک کا بیڑا غرق کر رہی ہے، اس میں اہلیت ہی نہیں ہے کہ ملک کو چلائیں مگر فکر کی ضرورت نہیں ہے ہم ہیں تو کیا غم ہے۔

جمہوریت خود کی اصلاح خود کرتی ہے اور بہتری لے کر آتی ہے کیونکہ یہ ہے تو عوام ہی کے فیصلے۔ جب جمہوریت کو ختم کیا جاتا ہے یا سلیکٹیو ڈیموکریسی لائی جاتی ہے اس کا مطلب عوام پر عدم اعتماد ہوتا ہے ایک سیاسی جمود پیدا ہو جاتا ہے اور بقول نظامی صاحب یہ خاموشی اور سیاسی جمود (خصوصاً امریت میں) میں عوام کو سیاسی طور پر بانجھ کر دیتی ہے۔ پاکستان میں بھی برطانوی سامراج کے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

وارثوں نے تمام باڈی پولیٹک کو سیکورٹی کے ارد گرد پھنسا کر رکھ دیا ہے، اسلئے میں کپلنگ کے اس نظریے کو (پاک فوج کے کندھوں پر بوجھ) نظریہ کہہ سکتا ہوں۔ یہاں پر پارلیمانی سیاست کو صرف کو۔آپٹ کرنے کے لیے رکھا گیا ہے اور کرپشن میں ملوث ہونے پر ان کو ملک کے تمام تباہی کا ذمہ دار قرار دے کر خود کو بری الذمہ کر دیتے ہیں۔ایک طرف خود کہتے ہیں کہ ہم پورا سسٹم چلانے والے لوگ ہیں جو حقیقت میں بھی ایسا ہے، مگر جب بات یہ کی جائے کہ ملک پیچھے جارہا ہے اور قرضوں میں جکڑا ہوا ہے اس کی ذمہ داری بھی لے لیں مگر نہیں ان کے لئے سیاسی لوگ ہیں، ذمہ داری ان پر ڈال دی جاتی ہے۔ حال ہی میں وزیراعظم نے پچھلے دس سالوں میں لیے گئے قرضوں کی تحقیقات کا عندیہ دیا ہے مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کر لیتے ہیں تو ان کو پتہ چلے گا کہ ان میں بھاری رقم ڈیفنس میں گئی ہے مگر کیا تب بھی حساب کر پائیں گے، بالکل نہیں کیونکہ کلونیلائزیشن کا اصول ہے کہ سب برابر ہے مگر کچھ لوگ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی برابر ہے۔اور جو زیادہ برابر ہے وہ بھلے بڑے بڑے کاروباری ٹائکون بنے، ہر کاروبار پر قبضے کی صورت پیدا کر دے یا حکومتی معلومات کو اپنے انٹرسٹ کے لیے استعمال میں لائے جو کانفلکٹ آف انٹرسٹ کے زمرے میں آتا ہے مگر ان کا احتساب نہیں ہوگا کیونکہ ایک ادارے نے خوذ کو سب سے بالاتر بنایا ہوا ہے۔حال ہی میں ورلڈ بینک کی رپورٹ جاری ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی معاشی اصلاحات کے راستے میں چار سب سے بڑی رکاوٹیں ہے جس میں پاکستان کی ملٹری پہلے نمبر پر ہے اس میں بجٹ الوکیشن بھی آجاتا ہے، ریاستی اداروں کے کاروبار میں مونوپلی بھی آجاتی ہے۔اور یہی مونوپلی فری ٹریڈ کو کرنے نہیں دے رہا اسطرح پرائیویٹ کارپوریشنز کبھی بھی مقابلہ نہیں کر پائیں گے جس کا براہ راست اثر ملک کی معیشت پر پڑتا ہے اسلئے جدید دنیا نے یہ اصول پلے باندھ لیا ہے کہ

"ریاست کا بزنس، بزنس کرنا نہیں ہے"

بات بزنس تک محدود نہیں ہیں بلکے ہر ادارے میں مداخلت ہو رہی ہے، کیا پولیس، کیا عدلیہ اور کیا بیوروکریسی، اب تو جمہوریت بھی ان کے ہاتھ میں آگئی ہے یہاں تو الیکشن کمیشن فوج کے بغیر الیکشن

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

نہیں کروائی کیونکہ اس کو ان کا محتاج بنایا گیا ہے۔ پولیس اور بیوروکریسی میں آفیسرز کی تعیناتی و ترقی صرف ان کے ساتھ وفاداری کی بناپر کی جاتی ہے۔ مقدمے ان کی مرضی سے بنائے جاتے ہیں مجھ پر مقدمہ بھی ان کے کہنے پر بناجب میں نے ان کے لئے ویڈیو بنانے سے انکار کر دیا اور سیکشن بھی وہ ڈالے ہیں جس کا انہیں اختیار بھی نہیں تھا۔ پولیس بالکل بے اختیار ہے۔ ہم پر ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک مقدمہ درج کیا گیا تھا اور ہم تفتیش دینے کے لیے تھانے پہنچے تو ایس ایچ او نے کہا کہ ہم مجبور ہیں ورنہ یہ مقدمہ بنتا ہی نہیں، جس میں مجھے مدعی بھی بنایا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آئی ایس آئی اور ایم آئی کے اہلکار آئے خود ہی پرچہ کاٹا اور میرے سامنے رکھا اور کہا کہ دستخط کرو۔

اس طرح پولیس اور بیوروکریسی کو چھوڑیں عدلیہ میں بھی ان کی مداخلت ناقابل یقین حد تک ہے لوگ شاید آج ارشد ملک کی ویڈیو یا جسٹس شوکت صدیقی کے بیان پر حیران ہو رہے ہوں مگر میں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میری ضمانت ٹرائل کورٹ سے ریجیکٹ ہوئی تو ہائی کورٹ گئے، میرا کیس ایسا نہیں ہے جس میں ضمانت نہ دی جاسکے اور ہائی کورٹ کو لازماً دینی چاہیے تھی مگر جس دن میری ضمانت پر فیصلہ ہو رہا تھا اس سے ایک دن پہلے میرے پاس انٹیلی جنس ادارے کے بندے آئے اور پوچھا کہ میرا دماغ ٹھکانے آگیا ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ میرا دماغ تو پہلے بھی بھٹکا ہوا نہیں تھا اور نہ ابھی کہیں بھٹکا ہوا ہے جو ٹھکانے پہ آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے کہ اگر ضمانت ملے تو نکل کر کیا کرو گے۔ میں نے کہا میں اپنے مظلوم قوم کی بات کروں گا اور یہی میرا دین مذہب اور روایات اور قومی تاریخ کہتی ہے۔ اس کی اگلے روز پتہ چلا کہ میری ضمانت ریجیکٹ کر دی گئی ہے۔ جبکہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کا کیس تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس کا 6 فروری 2019 کا فیصلہ جس میں اس نے آرمڈ فورسز کو تنبیہہ کیا ہے کہ وہ اپنے آئینی اختیارات سے تجاوز نہ کریں۔ پہلے آئی ایس آئی نے درخواست دی کہ کہ اس سے آرمڈ فورسز کا مورال خراب ہوگا۔ جب اس سے بات نہ بنی تو اس کے خلاف صدارتی ریفرنس دائر کر دیا۔ سچ کہتے ہیں کہ یہ بند کمرے میں قید ہاتھی ہے جو کبھی کسی کو اپنے پیروں تلے روند ڈالتا ہے تو کبھی کسی کو، اگر کوئی چیخے تو الٹا

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ناراض بھی یہی ہوتا ہے کہ میرا مورال گر گیا ہے۔ چیخنے والا پھر میری طرح ایکٹیوسٹ ہو یا ملک کا کوئی جج ہو۔ ان کو چیخنے کی سزا ملے گی۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ تمام اداروں میں ان کے مداخلت ان کی بہتری کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ غیر آئینی کاموں میں بغیر پوچھ گچھ کے معاونت حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اس طرح دیگر اداروں میں اپنے ارتقا کی بنیاد پر دھیرے دھیرے بہتری مفقود ہو جاتی ہے اور پھر جیسے میں نے پہلے کہا کہ ایک طرف سے یہ کہتے ہیں کہ ہم سسٹم چلاتے ہیں تو دوسری طرف ملک کی بگڑتی صورتحال سے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں تو اس طرح ہی اداروں کی بدنامی سے بھی خود کو بری الزمہ کرتے ہیں۔

اس طرح باقی تمام اداروں کی بدنامی سے ان کا فائدہ بھی ہے، یہ اپنے نمک خواروں سے یہ باور کرواتے ہیں کہ شکر ہے کہ اس ملک میں پاک آرمی جیسا ادارہ ہے ورنہ باقیوں کا جو حال ہے، اس سے ملک تباہ ہو جاتا، یہ نہیں کہتے کہ باقیوں کا حال بھی ان کی وجہ سے خراب ہے۔ میری ایک پیشی کے دوران ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکار نے مجھے کہا کہ تم لوگ آرمی پر تنقید کیوں کرتے ہو میں نے کہا جن مسائل کا ہمیں سامنا ہے وہ مسائل انکے پیدا کردہ ہے تو ہم کیا کریں ان کی جگہ واپڈا پر تنقید کریں؟ اس نے کہا کہ اس ملک میں صرف ایک ہی ادارہ تو رہ گیا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ملک کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ میں نے کہا شاید آپ کو معلوم نہین کہ یہ ملک ایک دفعہ ٹوٹ چکا ہے وہ بھی ان کی وجہ سے، اس نے کہا نہیں وہ توز ولفقار علی بھٹو کی وجہ سے ٹوٹا تھا، وہ نہیں مان رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اقتدار آرمی کے پاس تھا الیکشن میں مجیب الرحمن کو اکثریت حاصل تھی، جمہوریت کی رو سے اقتدار اسے منتقل کیا جاتا، کسی کا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا تم اس دور میں پیدا ہوئے تھے، تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میں نے کہا کیا آپ نے حضرت محمد صلی اللہ وسلم کو دیکھا ہے یا اس دور میں تھے تو آپ کس طرح مسلمان ہوئے۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

یعنی بات بڑی واضح ہے کہ آرمی کی باقی اداروں میں مداخلت نہ صرف آئین کی خلاف ورزی ہے بلکہ اسی طرح کسی بھی طرح سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔اور پاکستان کا آئین بھی اس حوالے سے بڑا واضح ہے آئین کا آرٹیکل 244 کہتا ہے کہ مندرجہ ذیل حلف ارمڈ فورسز کا ہر فرد اٹھائے گا اور حلف یہ ہے

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے

میں حلف اٹھاتا ہوں کہ میں پاکستان کا سچا حامی اور وفادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی پاسداری کروں گا اور یہ کہ کسی بھی طرح کے سیاسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہونگا اور پاکستان آرمی (نیوی، ائرفورس) کے اندر رہ کر پاکستان کی خدمت کرونگا جیسے قانون کی رو سے ضرورت ہے

اللہ ہمارا حامی وناصر رہے

اب کوئی اتنے واضح حلف کی خلاف ورزی کرے تو اس کو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔یہاں تو آئین کی بساط ہی کئی دفعہ لپٹی گئی اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونا تو چھوڑیں پورے ملک کی سیاست کو ہی خود چلارہے ہیں جہاں تک صرف آرمی کے اندر رہ کر ملک کی خدمت کا تعلق ہے تو یہاں تو عدلیہ، پولیس اور بیوروکریسی سمیت ہر ادارے کے اندر رہ کر ملک کی خدمت کی جارہی ہے۔

اللہ اس ملک کا حامی وناصر رہے۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

نقیب اللہ" شہید کے والد سے گلہ

سینٹرل جیل میں جہاں پر مجھے رکھا گیا ہے، یہاں پر صرف پیشی والے قیدیوں کو چند دن کے لیے رکھا جاتا ہے۔ پیشی والے قیدی وہ ہوتے ہیں جو جیل کے اندر کوئی جرم کرلیں۔ مجھے کال کھوٹری سے دن میں ایک گھنٹہ باہر نکالتے تھے، ایک دن میں اپنے کال کوٹھری کے باہر بیٹھا ہوا تھا، کہ ایک صوفی بندے کو جس کی عمر کوئی چالیس کے قریب ہوگی لایا گیا۔ جسامت اور رنگ سے لگ رہا تھا کہ پشتون ہے۔ اس کی تلاشی لی گئی پھر اس کو یہاں دس کال کھوٹریوں میں سے ایک میں ڈال دیا گیا۔ میں نے منشی سے پوچھا کہ کون ہے یہ اور کس پیشی میں آیا ہے۔ اس نے کہا یہ قاری احسان ہے، جھگڑے کی پیشی میں آیا ہے۔ قاری احسان نام تو سنا ہوا لگتا ہے مگر کہاں سنا ہے۔ ابھی میں اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا کہ یہ نام کہاں اور کس حوالے سے سنا تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات سے منشی نے اندازہ لگایا تو مجھے کہا کہ "یہ وہی قاری احسان ہے نقیب اللہ" والا"۔

"ہاں بلکل، راؤ انوار نے جب نقیب اللہ کو شہید کر دیا تھا اور پشتون قوم کی طرف سے اس کا سخت رد عمل آیا تو راؤ انوار نے دعوی کیا تھا کہ نقیب اللہ حکیم اللہ محسود کا ڈرائیور تھا اور قاری احسان کا (چین) والا تھا، (جیل میں (چین والا) اسے کہتے ہیں جو ایک ہی مقدمے میں نامزد ہو) وہی قاری احسان جس کے بارے میں جیو ٹی وی کے شاہ زیب خانزادہ نے کہا تھا کہ سینٹرل جیل میں قید قاری احسان نے نقیب اللہ" کو اپنا ساتھی ماننے سے انکار کر دیا ہے"۔ میں اپنے دل ہی دل میں یہ سوچتا رہا اور منشی پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ واہ میرے اللہ، میں اگر چاہتا بھی تو کسی صورت یہاں جیل میں قاری احسان سے نہ مل سکتا، مجھے تو یہاں کے قیدیوں سے ایسا دور رکھتے ہیں کہ نہ جانے میں ان سے ہاتھ ملاؤں گا تو وہ فورا کوئی زومبی بن جائیں گے اور یہاں قاری احسان کو خود ہی میرے پاس لے آئے۔ اگلے روز میں اور قاری احسان آمنے سامنے تھے۔ سلام دعا کرنے کے بعد میں نے اپنا تعارف کیا اور وہ پھر سے وہ بڑے پرتپاک انداز سے ملا۔ پشتون قوم سے گلہ کر رہا تھا کہ نقیب اللہ کے کیس میں میرا نام آنے کے بعد اور میرے انکار کے بعد بھی کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

پوچھا کہ ہوا کیا تھا اور یہ نقیب اللہ نام انہوں نے تمہارے ساتھ کیوں لگایا تھا۔ کہا کہ نقیب اللہ میرا ایک چین والا بھی تھا جس کے والد کا نام فلاں اور فلاں جگہ کا رہنے والا تھا۔ اسے نقیب اللہ محسود سے چند سال پہلے قتل کیا گیا تھا۔ میں نے کہا پھر، اس نے بتایا کہ یہاں میرے پاس نقیب اللہ محسود کے واقعے کے بعد بندے آئے اور راؤ انوار خود بھی آیا تھا اور باہر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں صرف یہ بیان دوں کہ نقیب اللہ محسود میرے چین والا تھا تو جتنی رقم بولو گے وہ رقم ہم وہاں پہنچا دیں گے جہاں تم کہو گے اور تمہاری رہائی ہمارے ذمے ہو گی۔ انہوں نے بہت لالچ دیا اور کہا کہ اگر نہیں مانتے تو نتائج بھی اچھے نہیں ہوں گے۔ میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ میں اپنے ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا ایک شخص کو میں جانتا تک نہیں ہوں اس کو کیوں اپنے ساتھ ملالوں۔ باقی اللہ کو معلوم ہے کہ میں خود بھی کتنا مجرم یا معصوم ہوں اور اس سے ہی رہائی کی امید ہے۔ لیکن اگر اسطرح میری رہائی ممکن ہے تو نہیں چاہیے مجھے ایسی رہائی۔ پھر وہ مجھ سے بیزار ہو کر روانہ ہوئے، بعد میں پولیس کی جے آئی ٹی ملنے آئی تو میں نے اس سے کہا کہ جو میرے چین والا تھا، وہ یہ نقیب اللہ محسود نہیں ہے، اس کو تو نہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی دیکھا ہے اور نہ اسے میں جانتا تھا۔ یہ سن کر میری کیفیت بڑی عجیب ہوئی، اپنی کال کھوٹری پر واپس آگیا اور پٹیل کو بولا کہ مجھے بند کر دو اور پھر رات تک سوچوں میں ڈوبا رہا۔ رات کو جب سب سو چکے تھے، میں اپنی کوٹھی کے سلاخوں پر آیا، قاری احسان کی ساری باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں باہر پولیس موبائل کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو ملیر کینٹ تھانے کی حوالات کی یاد آئی جب میں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور تھانے دار نے مجھے آکر کہا کہ شکر ادا کرو کہ تم یہاں راؤ انوار کے ٹائم پر نہیں آئے وہ تو فورا کلیئر کرنے کے لئے جا چکا ہوتا اور پھر جب مجھے بکتر بند میں لایا جا رہا تھا اور مجھے ایسا لگا کہ مجھے انکاؤنٹر کرنے لے جا رہے ہیں تو نقیب اللہ اور اسکے جیسے ہزاروں کا سوچ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے تھے کہ نہ جانے ان پر کیا نہیں گزرا ہو گا، کیا انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ یہ ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہیں، یہاں سب سے ارزاں تو پشتونوں کا خون

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

تھا جس کا کوئی جواب طلب نہیں کرتا تھا اور پھر میرے سامنے نقیب اللہ کے والد محمد خان کی باتیں گزریں کہ کوئی نقیب اللہ کے نام پر اداروں کو بدنام نہ کریں، ہم اپنے اداروں کے ساتھ کھڑے ہیں اور اس طرح کے اور بیان۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر قاری احسان یہ بیان دے دیتا تو شاید نقیب اللہ کے والد انہی اداروں سے اپنی اور اپنے گھر والوں کی جان کی بھیک مانگ رہے ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بات اسے بھی معلوم ہے کہ یہاں اداروں پر کتنا بھروسہ کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ جب نقیب اللہ کو 3 جنوری کو اٹھایا گیا تو ہم ان کے گھر کے کسی فرد کو سامنے آنے کا کہہ رہے تھے، وہ تو تب نہیں آئے جب تک پشتونوں نے ان کے لیے سارے ملک کو سر پر نہ اٹھالیا۔ اگر پشتون آواز نہیں اٹھاتے تو شاید نقیب اللہ کی لاش بھی اٹھانے کوئی نہ آتا، وہ بھی اِنہوں نے اٹھائی۔ پشتونوں نے یہ سب کچھ اس لئے نہیں کیا تھا کہ محمد خان صاحب نے درخواست کی تھی۔ بلکے انہوں نے سب کچھ پشتونولی اور انسانیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ ایک مظلوم پشتون بے گناہ قتل کیا گیا ہے اور آج جب ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا وقت آیا تو آپ دیکھیں کہ کہیں آپ پشتونوں کے مقابلے میں اُن کے ساتھ تو نہیں کھڑے کہ جنھوں نے نہ صرف نقیب اللہ کو شہید کیا ہے بلکے اُسے دہشتگرد ڈیکلئر کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور بات تو صرف نقیب شہید کی نہیں بلکے اس جیسے ہزاروں کی ہے اور لاکھوں اور کروڑوں کے آنے والے مستقبل کی ہے۔ اس دنیا میں کسی نے نہیں رہنا، یہاں ہر کسی نے اپنا کردار چھوڑ کر جانا ہے۔ یاد رکھیں کہ تاریخ میں لکھا جائے گا کہ جب آپ کا کوئی نہیں تھا تب پشتون آپ کے ساتھ کھڑے تھے۔

2 ستمبر 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی سیکورٹی

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

زندگی اور موت

دہشگردی کیخلاف جنگ میں اس نوجوان پشتون نسل نے اپنے بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا ہے زندگی اور موت کے اسرار و رموز کسی حد تک ان پر منکشف ہوئے ہیں۔ دہشت گردی کی جنگ میں ایسا ایک انجانا سا خوف باقاعدہ اسٹریٹیجی کے تحت پھیلایا گیا کہ جیسے ابھی کوئی درندہ نکل آئے گا اور ہمیں کھا جائے گا۔ خبر آتی تھی کہ فلاں کو ذبح کر دیا گیا ہے اس کے سر کے ساتھ پرچی پر لکھا ہوا ملتا تھا کہ یہ امریکہ کا جاسوس تھا۔ چند سال پہلے میں نے اس پر ایک ریسرچ کرنے کا سوچا۔ ساؤتھ ایشین ٹیررازم پورٹل سے فاٹا ٹائم لائن دیکھے جس میں 2002 سے 2015 تک کے ٹائم لائن اُس وقت موجود تھے۔ اخباروں میں بھی سرچ کیا اور ان دونوں سے میں نے تمام وہ خبریں اٹھائیں جس میں نامعلوم یا طالبان کی جانب سے مبینہ جاسوسوں کی اموات کی خبریں رپورٹ ہوئی تھیں۔ ان تمام کی اعداد و شمار نکالی اور اسطرح جاننے کی کوشش کی کہ ان مبینہ جاسوسوں کو کس ملک کا جاسوس کہہ کر قتل کیا گیا تھا اور یہ جان کر مجھے حیرانی ہوئی کہ ان میں 90% کو امریکی جاسوس کا نام دے کر قتل کیا گیا تھا حالانکہ یہاں تو پاک آرمی سے لڑا جا رہا تھا تو زیادہ تعداد پاکستانی یا پاک آرمی کے جاسوسوں کی ہونی چاہیے تھی۔ اس سے بھی ایک گیم سمجھ میں آجاتی ہے۔ بہر حال یہ اموات بہت خوفزدہ کر دینے والے ہوتے تھے لوگ اس سے بھی بہت ڈرتے تھے کہ اگر ان کو بھی قتل کر دیا گیا تو قتل ہونے کے ساتھ ساتھ جاسوسی کا لیبل بھی لگے گا۔ زندگی عجیب خوف کی کشمکش میں گزر رہی تھی۔

جیسے میں نے پہلے بتایا کہ ان کے نشانے پر مشران یا ایسے خاندان تھے جو اپنے علاقے میں نامی گرامی تھے۔ اسلئے مجھے اپنے خاندان کو نقصان کا اندیشہ ہمیشہ سے لگا رہا۔ ایک دفعہ تولدھا کے امیر نے میرے والد صاحب کو 500 روپے دکھائے تھے کہ اس پر اپنے لئے کفن خرید لینا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب کے کانیگرم کے ایک پیر خاندان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ خاندان بہت معزز اور پڑھا لکھا خاندان تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ انکا گومل میں واقع گھر پر حملہ ہوا ہے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

جس میں ان کے گھر کے کئی افراد بمعہ خواتین شہید کر دی گئی تھیں۔ میرے والد کو ضرور ان کے گھر جانا تھا ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا تھا۔ ان کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا، کہتے ہیں کہ ایک خاتون قرآن کو لے کر ان کے سامنے آئی مگر ظالموں نے اس کے ساتھ قرآن کے بھی پرخچے اڑا دیئے۔ بعد میں وہی پر جرگہ ہوا جس میں بہت سے طالبان آئے تھے اور وہاں جب میرے والد کو دیکھا گیا تو اس کے بھی موت کا بندوبست کرنے لگے۔ دہشتگردی کی اس جنگ میں زندگی گویا ایک کلاشنکوف سے نکلی گولی اور کسی جسم سے آر پار ہونے کے بیچ کا لمحہ بن کر رہ گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگوں نے اس کے خلاف قدم نہیں اٹھایا تھا۔ لشکر بھی بنے تھے مگر آرمی آپریشنز درمیان میں چھوڑ کر طالبان کے ساتھ امن معاہدہ کر لیتی تھی جس سے یہ اور بھی مضبوط ہو جاتے اور پھر ان لوگوں کو چُن چُن کر قتل کر دیا جاتا جنہوں نے لشکر بنانے میں کردار ادا کیا ہوتا تھا۔ کچھ لوگ اپنی نادانی سے اس کو خدا کی مدد قرار دے کر ان کی جانب راغب ہو جاتے تھے۔ جب گیم پتہ چلی تو عام لوگ مخالفت یا حمایت سے بلکل کنارہ کش ہو گئے مگر ایک خوف کی زندگی تھی جیسے لوگ چند لمحے اور جینے کی تمنا میں گزارتے تھے۔ بعد میں ظلم اور زیادتی آرمی نے ایسی کی کہ لوگ طالبان والے ظلم تو گویا بھول ہی گئے، مگر اس ساری صورتحال نے ایسا جمود پیدا کر دیا تھا کہ معاشرہ ان کے ظلم تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر رہے تھے۔ ہم نے کئی ایک ہمارے مشران کو قوم کی بات کرنے کی پاداش میں قتل ہوتے ہوئے دیکھا مگر مجال ہے کہ کوئی یہ کہتا کہ ان کے ساتھ برا ہوا ہے بلکہ کہتے کہ یہ تو ہونا ہی تھا جب کوئی حق کی بات کرے گا، اس کے ساتھ تو ایسا ہی ہو گا۔ جب ہم نے قوم کے لیے آواز اٹھائی تو بہت سارے بندے کہتے کہ بات تو تم لوگوں کی سو فیصد درست ہے مگر ہو گا کچھ نہیں تم لوگوں کی موت مقدر ہو گی۔

یہ موت کیا چیز ہے ہم موت سے کیوں بھاگتے ہیں کہ جب ہم اس سے کسی بھی صورت میں بھاگ نہیں سکتے یعنی اگر میں چھپ رہ کر سو سال بھی زندہ رہوں تو اس کا کوئی مجھے فائدہ بتائیں۔ سو سال کے کسی بابا سے پوچھو کہ سو سال کیسے گزرے؟ اس کے لیے سو سال سو گھنٹے کے برابر بھی نہیں

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہیں۔ تو جب میں اپنے سو سال پورے کرلو نگا تو کیا خوشی مناؤں گا کہ میں نے ایک بہت بڑا تیر مار لیا ہے کہ سو سال گزار دیئے۔ زندہ رہنا اور موت کی آغوش میں چلے جانے کے درمیان فرق کیا ہے؟

زندہ وہ ہے جو اپنے ارد گرد کے ماحول کو سدھارنے کی کوشش کرے، برائی اور ظلم کے خلاف اٹھ سکے، لوگوں کی آہوں کو سن سکے، اپنی زبان سے جابر کو جابر کہہ سکے۔ جبکہ مردہ وہ ہے جس کے سامنے قوم کی مائیں بہنیں اور بچے گریہ کریں اور اس کو ان کی کوئی پروا نہیں، وہ ہر چیز سے غافل ہے، دنیا کی کوئی زیادتی اس کے ضمیر کو نہیں جگا سکتی۔ ہم اگر مردوں کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہیں تو زندہ کہلائے جا سکتے ہیں مگر زندہ ہونگے نہیں، چلتے پھرتے لاشیں ہونگی۔ ہمیں موت اور زندگی کو زیادہ شعوری طور پر سمجھنا ہوگا۔ انسان ایک جہاں سے دوسرے جہاں کو منتقل ہو جاتا ہے، اس کا جسم اس مٹی میں تحلیل ہو جاتا ہے جہاں سے لیا گیا تھا وہ ایک شاعر کہتا ہے کہ

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اس دنیا میں لوگ نہیں بلکہ کردار جیتے ہیں اور وہ کردار کبھی نہیں مرتے، صرف مہمان بدلتے رہتے ہیں۔ اس کردار کو نبھانے کی صورتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ آپ نے مذہبی کتابوں میں فرعون نمرود شداد اور یزید کے بارے میں پڑھا ہوگا، یہ لوگ ایک کردار کے نمائندہ لوگ ہیں، یہ کردار اس سے پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں اور یہ سلسلہ آگے یونہی چلتا رہے گا اس کے مقابل میں کردار موسی ابراہیم اور حسین جیسے ہیں اور یہ آج بھی ہیں اور یہ آگے بھی قیامت تک رہیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک ماضی کے کسی نہ کسی کردار میں ہے اور یہ فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ ہم اپنے لیے کون سا کردار پسند کرتے ہیں۔

دنیا کی زندگی برائی اور اچھائی کے درمیان جنگ کا نام ہے جس میں لازماً ایک طرف جانا ہوگا۔ اس میں نیوٹرل نہیں رہا جا سکتا، نیوٹرل صرف وہ ہوگا جو لاش بن چکا ہوگا۔ ہمارے یہاں فرعونیت والے کرداروں نے لوگوں کو اتنا خوفزدہ کیا رکھا کہ ایک طرح سے ہمیں اللہ پر سے یقین ہی اٹھ گیا۔ یہ

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

دعوے کہ ہم کسی کو مار سکتے ہیں، کسی کو بے عزت کر سکتے ہیں، یا کسی کو لاپتہ کر سکتے ہیں یہ سب خدائی دعوے ہی تو ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے فرعون نے کیے تھے آج ہمارے سامنے بڑے واضح طور پر ان خدائی دعوؤں کا اقرار کیا جاتا ہے مگر ہم پھر بھی انہیں فرعون کہنے کو تیار نہیں۔ میرے پاس یہاں سینٹرل جیل میں انٹیلیجنس والے آئے اور یہی دعوے کرنے لگے، میں نے کہا کہ اگر میں تمہاری بات مانو تو ایمان سے جاتا ہوں اور تمہاری بات مان کر مجھے پھر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ پھر مجھے تمہارے سامنے سجدہ کرنا چاہئے۔ جس کو چاہا اٹھالیا، غائب کر دیا، قتل کر دیا، بمباری کرو، ہم تمہیں وہاں سے ٹارگٹ کریں گے کہ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا، جس کو چاہا وزیر اعظم بنا دیا اور وزیر اعظم کو جیل میں ڈال دیا۔ جو کچھ ہمارے آئین کی صورت میں منظور کیا گیا ہے اس میں سب کے حدود متعین ہیں اگر اس پر کوئی چلتا ہے تو ٹھیک، ورنہ بے قابو اختیارات اور اسکا استعمال خدائی اختیارات حاصل کرنے کے برابر ہے۔ باقی مجھے اگر کوئی کہتا ہے کہ ہم تمہیں موت دیں گے، میں ان سے کہوں گا کہ موت میرے لیے ایک نیا تجربہ ہو گا جس سے مجھ پر کئی اسرار کھل جائیں گے۔ کئی سوال جو میرے شعور کے تہہ خانوں میں پڑے ہیں جو ہر وقت بے چین رکھتے ہیں، اُن سوالوں کو جواب مل جائیں گے۔ میں وہ تجربات محسوس کرونگا جس کے بارے میں آج تک صرف تصور کرتا رہا ایسے اسرار کھلیں گے جو اس دنیا میں تصور نہیں کئے جا سکتے تو یقیناً موت آپ کا ایک بہترین تحفہ ہو گا جو مجھے آپ دینگے۔ موت ایک ایسا خوف ہے جو ہمارے دلوں میں راسخ کر دیا گیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں۔ ہم جتنا بھی اس سے بھاگیں گے بالآخر اس کے آغوش میں آنا ہی ہو گا۔ چھپ رہ کر اور ظالموں کے ظلم پر بے حس ہو کر ہم اپنے لئے ایک سیکنڈ کا اضافہ بھی نہیں کر سکتے بس کامیاب وہ ہے جس کو موت کا خوف فرعونوں یا منافقوں کے کردار کی طرف نہ لے کر جائے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا سے وابستگی خصوصاً رشتے انسان کو ڈرپوک بنا دیتی ہیں، معاشرے کے لیے کٹھن وقت میں ایک متحرک انسان بننے سے روکتی ہیں۔ حلانکہ زندگی اور موت کا رشتہ ایسا ہے کہ جیسے گھر میں بیس بندے ہوں

Scanned with CamScanner

کہ جن کو ایک سامنے دوسرے گھر میں شفٹ ہونا ہے لیکن یہ منتقلی ایک ایک کر کے ہو۔ سبھی کو یقین ہے کہ انہوں نے سامنے والے گھر میں ہر صورت اور ہر قیمت پر جانا ہے مگر پھر بھی جب ایک بندہ ذرا پہلے جا رہا ہو تو اس کی جدائی پر گریہ وزاری کریں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی تھوڑے عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو جائے اور اس کو ہم خود کے لیے نا قابل تلافی نقصان سمجھتے ہیں کہ جیسے دنیا فنا ہو گئی ہے بس اسی ڈر اور خوف کا فائدہ فرعونی کردار والے اٹھاتے ہیں اور ہمیں حق کے راستے سے روک لیتے ہیں بلکہ ان کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہم سب کو اس گھر سے سامنے والے دوسرے گھر میں جانا ہے اگر ہم اپنے اس تھوڑے سے جدائی کے خوف پر قابو پالیں گے پھر کچھ بھی نہیں ہے، ظالم سے ظالم اور بڑے سے بڑا خدائی کا دعویٰ کرنے والا کچھ نہیں بس ریت کی دیوار ہے اور آگے ایک بھرپور زندگی ہے جس کے لیے ہمیں زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کی لالچ کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

18 اگست 2019

عالم زیب محسود

سینٹرل جیل کراچی

(c) ketabton.com: The Digital Library

ریاست کے لیے آگے راستہ کیا ہے

ہر ریاست معاشی ترقی کے لئے سٹیبلٹی یا استحکام مانگتی ہے اور سٹیبلٹی کوئی ایسی چیز نہیں جس کو مسلط کر دیا جائے، جیسے پوسٹ کالونیل معاشروں میں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں اظہار رائے پر قدغن لگا دیتی ہے، میڈیا کے پر کاٹے جاتے ہے، انسانی حقوق کی بات کرنے والے شر پسند بنا دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ استحکام ریاستی اداروں کے عمل اور پالیسیوں کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے یعنی کس حد تک ریاست اور رعایا میں اچھا تعلق ہے۔ اگر یہ تعلق یا رشتہ استوار نہ ہو سکے تو عدم تحفظ پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے اور اس سے ہی شخصی اور معاشرتی شناخت جنم لیتی ہیں جیسے کہ اب پشتون، بلوچ، سندھی اور اردو بولنے والوں کو سنجیدگی سے لگنے لگا ہے کہ ان کے ساتھ روا رکھے جانے والا عمل یا ان کی محرومیاں اُن کی شناخت کی وجہ سے ہیں، جس کو پاکستانی پاور ایلیٹ بیرونی عوامل کے ساتھ الجھا رہی ہے۔ پاور ایلیٹ کو لگتا ہے کہ اس طرح کی ہر آواز ہماری نیشنل سکیورٹی کے لیے خطرہ ہے اور اس طرح کی ہر آواز کو دبا کر ہی استحکام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک مضبوط مرکز پر زور دیتے ہیں اور صوبائی خود مختاری کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کو 72 سال ہو چکے ہیں مگر یہاں استحکام کے نام پر صرف سکیورٹی ایلیٹ نے خود کو مستحکم کیا ہے جس سے یہاں بسنے والے مختلف قومیتوں میں احساس محرومی بڑھی ہے، ان کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے تمام اہم مسئلے سیکیورٹی ایلیٹ کے پاس چلے جانے سے تو خصوصاً پشتون قوم نے ایسے نقصان اٹھائے ہیں کہ ملک سے اپنی وابستگی پر ہی سوال اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وفاقی یونٹس کو فیصلوں میں شریک نہ کرنا یا وفاق کی اصل روح کو خاطر میں نہ لانا یہی نتائج دے سکتا ہے کہ جب سیکورٹی پاور ایلیٹ نے سمجھا کہ ایک قوم کی پروفائلنگ سے مفادات حاصل ہوں گے تو نسلی پروفائلنگ کر دی، جب لگا کہ پورے معاشرے میں کلاشنکوف کلچر عام کرنے سے مفادات حاصل ہونگے تو پورے معاشرے کو شدت پسند کرنے سے گریز نہیں کیا۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس لئے آگے کا رستہ بڑا واضح ہے اس ملک میں قومیتوں کے وجود کو تسلیم کیا جائے جہاں اُن کے مفادات کا تحفظ ہو، ان کو سیاسی فیصلوں میں صوبائی خود مختاری حاصل ہو۔ ایک جامع اور روادار معاشرہ بنانے کی سعی کی جائے، ریاستی اداروں کو آئینی حدود سے تجاوز کرنے سے گریز کرنا ہو گا۔ ایک فیڈریشن کے طور پر ملک کو چلانا ہو گا جہاں وفاقی یونٹس یکجا ہو کر تمام طاقت کا منبع ہوں، جہاں ملک کو مختلف نظریات کا چورن بیچ کر نہ چلایا جائے بلکہ مفادات کی بنیاد پر چلایا جائے۔ ان متفرق نظریات پر اب تک صرف اسٹیبلشمنٹ نے اپنی عیاشی کی ہے۔ ممالک مفادات پر چلتے ہیں اور جو ممالک اپنی یونٹ کے مفادات کا خیال نہیں رکھتے، ان ممالک کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ نزدیکی تاریخ میں ہم نے یہ سب دیکھا اور یہی ازل سے ہوتا آرہا ہے۔ نزدیکی تاریخ میں ہمارا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا کیونکہ ہم بنگلہ دیش کے مفادات کو پامال کر رہے تھے۔ انڈونیشیا سے مشرقی تیمور علیحدہ ہوا، سوڈان سے ساؤتھ سوڈان علیحدہ ہوا، یوکرائن سے کریمیا علیحدہ ہو گیا، چیکوسلاواکیہ آج ایک ریاست نہیں رہا، ان سب میں جب وہاں بسنے والے قوموں کے مفادات غضب ہوئے تو جدائی ان کا مقدر بنی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو آمرانہ روش رکھنے والے ممالک تھے وہاں علحیدگی خون کا سمندر پار کرنے کے بعد ملی جبکے وہ ممالک جہاں تہذیب یافتہ معاشرہ تھا، وہ ایک آسان اور جمہوری اصول یعنی ریفرنڈم کے ذریعے علحیدہ ہوئے۔ اس طرح چند مثالیں ایسی بھی ہیں کہ جہاں علحیدگی کی تحریک چلی مگر جب ان کے ڈیمانڈ مان لئے گئے، وہ آج بھی اس ریاست کا حصہ ہیں۔ انڈونشیاء میں آچے میں تحریک چلی مگر جب وہاں جمہوریت آئی انہوں نے ان کے تمام مطالبات تسلیم کیے تو آج بھی آچے انڈونشیاء کا حصہ ہے۔ ہندوستان کے مشرقی صوبوں میں تحریکیں چلی، ہندوستان نے مطالبات جو حقوق سے متعلق تھیں، تسلیم کر لئے۔ کشمیر کا مسئلہ حقوق کا نہیں ہے بلکہ ناجائز قبضے کا ہے۔ ہمارے کیس میں بھی بات ناجائز قبضے کی طرف جاسکتی ہے جو ظاہر ہے جب وفاقی اکائیوں کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو گی کہ جو حاصل ہونی چاہیے اور یہاں بسنے والی قوموں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہ ہو گا پھر اس طرح کی حکمرانی کو ناجائز قبضہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

اسطرح ایک جامع اور رواداار معاشرے کا قیام انتہائی ضروری ہے، بیرونی براہ راست سرمایہ کاری صرف ان ممالک میں آتی ہے جہاں معاشرہ کھلی ذہنیت اور برداشت والا ہو، جہاں ادارے ہماری طرح بے لگام نہ ہو جو کسی کی تنقید کو برداشت نہ کر سکے اور ایسی آوازوں کو جیلوں میں ڈالے یا جان ہی لے لے۔ یہاں ملیشیاء ماڈل اپنانے کی بات ہوتی ہے مگر اپنا تو نارتھ کوریا کا ماڈل اپنایا ہوا ہے۔ ملک کو ایک سکیورٹی سٹیٹ بناکر سارے پڑوسی ممالک سے خود کو بند کر لینا کبھی بھی ملیشیاء ماڈل نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ریاستی ادارے اپنی آئینی حدود سے تجاوز نہ کریں اس طرح اگر ایک ادارہ سب میں مداخلت کرے گا تو اداروں میں ایولوشن نہیں ہو پاتی بلکہ بدانتظامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ وینیزویلا کی مثال ہمارے سامنے ہے، اس خطہ زمین میں سب سے زیادہ تیل کے ذخائر وینزویلا کے پاس ہے مگر آج وہاں افراتفری کا ماحول ہے، لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، ملک بینک کرپٹ ہو گیا ہے لاکھوں لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے تین عوامل ایسے ہیں جن پر سب متفق ہیں اور وہ ہیں

١ (بدانتظامی

٢ (کرپشن اور

٣ (بہت زیادہ بیرونی قرضہ جات۔

جیسے میں نے کہا کہ یہاں مداخلت سے بدانتظامی پیدا کر دی گئی ہے، کرپشن تو پورے معاشرے میں ناسور کی طرح پھیلی ہے اور تیسری وجہ بیرونی قرضہ، اس میں تو پاکستان ایسا جکھڑا ہوا ہے کہ ساری اکنامی ہی آئی ایم ایف کے سپرد کر دی گئی ہے۔

)نوٹ: زر نظر تصویر میرے گھر کی ہے جہاں مشر گئے تھے جب میں جیل میں تھا، یہ سیکورٹی ایلیٹ کے پالیسیز کا شاخسانہ ہے۔(

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

سینٹرل جیل کراچی کی میری آخری تحریر

انٹیلی جنس اداروں کے ساتھ جیل میں 3 دفعہ مزاکرات

آج 16 ستمبر کا دن ہے اور آج مجھے ملاقات پر ساتھیوں نے بتایا کہ سپریم کورٹ نے میری ضمانت قبول کرلی ہے۔ سوچا یہاں مجھے کیسے رہائی کے نام پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی مگر اللہ نے ہمت دی کہ ہر تکلیف کا سامنا کیا اور ان ظالموں کی ایک بھی نہ مانی۔

جیل لانے کے بعد مجھے 15 دن کے اندر کسی عدالت میں پیش کرنا تھا مگر میری ابتدایی چالان اتنی لیٹ کی گئی کہ کویی ڈیڑھ ماہ بعد جا کر مجھے کلفٹن کی دہشتگردی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مجھ پر جو دفعات لگائے گئے تھے وہ ظاہر ہے پولیس صوبائی یا وفاقی حکومت کے اجازت کے بغیر لگانے کی مجاز نہیں تھی۔ مگر جیسے یہاں الٹی گنگا بہتی ہے تو مجھ پر دفعات ڈالے گئے۔ ٹرائل کورٹ میں ہم نے جاتے ساتھ ہی ضمانت پر رہائی کی درخواست دی مگر چونکے پولیس کے پاس اجازت نہ تھی اور صوبائی یا وفاقی حکومت کی اجازت ان کے پاس تھی نہیں، اسلئے چالان جمع نہیں ہوا اور میری ضمانت ریجیکٹ ہوگئی۔ ہم نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جسے اگلے روز کو فیصلہ سنانا تھا میرے ملاقات کی پرچی آئی جس میں آفس کی ملاقات لکھی تھی۔ آفس ملاقات کے لئے مجھ سے میری فیملی جیل خانہ جات کے صوبائی وزیر کے ریفرنس سے ملنے آتی۔ میں سمجھا شاید میری فیملی ہو۔۔ آفس پر پتا چلا کہ کچھ اور بندے ہیں۔ میں نے ان سے انکے بارے میں پتا نہیں کیا جو کے میں سمجھا کہ غیر ضروری تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیسے محسوس ہو رہا ہے، دماغ اپنی جگہ پر آیا ہے یا نہیں، میں نے کہا کہ میرا دماغ کہیں بھٹکا نہیں ہوا جو واپس اپنی جگہ پر آئے گا بلکے وہیں پر ہے جہاں پر تھا۔ اس نے پوچھا کہ اگر تمہاری ضمانت ایکسپٹ ہو جائے تو تم کیا کرو گے۔ یہ بات اس نے ایسے انداز میں کی کہ جیسے وہ ضمانت اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ میں نے کہا کہ میں وہی کروں گا جو میں کرتا آیا ہوں۔ میں ظلم کے خلاف کبھی چپ نہیں رہونگا اور یہی مجھے میرا دین، ایمان، قومی تاریخ و روایات حکم دیتی ہیں۔۔ انہوں نے مجھے رخصت کیا۔۔ اگلے روز میری ٹرائل کورٹ میں پیشی بھی تھی اور تب

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

معلوم ہوا کہ میری ضمانت ہائی کورٹ نے ریجیکٹ کر دی ہے جو کے میرے کیس میں حیرانی کی بات تھی جس کا اظہار بعد میں سپریم کورٹ نے مجھے ضمانت دیتے ہوئے بھی کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فیصلے کو سن کر میں مایوس ضرور ہوا۔ جب مجھے واپس جیل لایا جاتا تو جیل کے اندر مجھے کسی سپاہی کے حوالے کر کے بند وارڈ میں جہاں میری کال کھوٹری تھی، لایا جاتا۔۔ میں اکثر کسی طریقے سے جان بچا کر اکیلے چلے جاتا جس میں میں راستے میں موجود مسجد میں نماز پڑھ لیتا۔۔ جسکی مجھے اجازت نہ تھی، صرف نماز جمعہ کی 6 مہینے بعد اجازت ملی۔ جس دن میری ضمانت ریجیکٹ ہوئی، اس دن رمضان المبارک کا پہلا دن تھا اور پہلا روزہ ویسے بھی سخت ہوتا ہے تو عدالت آنے جانے میں کافی سفر تھا اور گرمی سخت تھی۔ مجھے بہت سخت پیاس لگی تھی، میں مسجد میں آیا اور نماز پڑھ کر میں نے اللہ سے صرف یہ کہا کہ تو سب بہتر جانتا ہے اور میں تیری رضا پر راضی ہوں۔ یہی کام میں نے ٹرائل کورٹ میں ضمانت ریجیکٹ ہونے کے بعد بھی کیا تھا، اور یہ سب مایوسی، اور روزے کی تھکاوٹ ایک دم سے رفو چکر ہو گئی۔ میری مذہب سے لگاؤ اسلیئے بھی ہے کیونکے میں نے پریکٹیکلی ایسے موقعوں پر اسکی افادیت کو دیکھا ہے جب اپکا ایمان ہو کہ ایک ذات ہے جو یہ دیکھ رہی ہے اور خدا مجھے اکیلے نہیں چھوڑے گا۔

رمضان کے بعد جون پھر ایک ملاقات آئی، مجھے اندازہ ہوا کہ کون ہو سکتے ہیں۔ آفس میں گھسا تو والد صاحب کو پایا۔۔ اس سے ملا تو اس نے کہاں کہ ان مہمانوں سے ملو۔ ان میں دو مرد تھے جس میں ایک میجر تھا اور ایک خاتون تھی جو آئی ایس آئی کی کوئی ڈائریکٹر تھی۔ ہماری یہاں پر بحث کافی خوشگوار تھی۔ میں نے انکے سامنے تمام مسائل رکھے۔ انہوں نے میرے والد کو خصوصی طور پر ڈیرہ اسماعیل خان سے منگوایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک ڈیل کے لئے آئے ہیں کہ اگر میں لکھ کر دوں کہ میں نے پی ٹی ایم چھوڑ دی ہے تو ہم تمہیں فوراً فارغ کریں گے۔ میں نے اسے کہا کہ میں حیران ہوں کہ ایسی بات کیسے کی آپ لوگوں نے، اگر میں نے ایسا کرنا ہوتا تو پہلے دن کر لیتا جب آپ لوگوں نے مجھ پر تشدد کروایا جس کو میں کبھی نہیں بھولونگا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ میں نے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

تمام معلومات جو لاپتہ افراد یا دیگر ظلم کے حوالے سے تھیں وہ ہم نے کسی اور کو دینے کے بجائے آپ کے ادارے سے شئیر کئے کیونکہ ہم آپ سے پر امید تھے مگر جو تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا، ابھی تمہارے سامنے کہتا ہوں کہ اب میری اس ملک کے لئے بھی کوئی امید باقی نہیں رہی بلکے مجھے خوف ہے کہ میرا ذاتی غصہ اجتماعی فیصلوں میں اڑے نہ آئے۔ میں نے کہا کہ بال پین تمہارے کوٹ میں ہے۔۔ یہ ایک کتاب ہے اور فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ اسکی والیوم کتنی ہو۔ وہ ناامید ہو کر وہاں سے گئے۔ میرے ساتھ جیل میں اس وقت قاضی طاہر تھے، انکو بھی میرے ساتھ بند وارڈ میں رکھا گیا تھا مگر تھے الگ الگ کال کھوٹریوں میں۔ ہم نے کافی درخواستیں کیں مگر نہ تو ہمیں ایک ساتھ رکھا گیا اور نہ ملنے کی اجازت ملی۔ اتنے نزدیک ہو کر بھی ہماری ملاقات صرف کورٹ جاتے ہوئے ہوتی یا جب پی ٹی ایم کے ساتھی ملاقات کے لئے آتے۔ مزاکرات کے حوالے سے تیسری دفعہ وہ ستمبر میں آئے۔ اور اس دفعہ وہ ہمارے کراچی پی ٹی ایم کے مشر نور اللہ کو بھی ساتھ میں لائے تھے۔۔ میں اور قاضی طاہر ملاقات کے لئے گئے۔ نور اللہ اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں بھی لائے تھے، ہمیں اندازہ ہوا کہ انکی باتیں کیا ہوتی ہیں اسلئے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا زیادہ بہتر لگا۔ ہم نے انکو کہا کہ جو میں نے اپنی گرفتاری کے پہلے روز کہا تھا، وہی تین مہینے بعد بھی کہا، چھ مہینے بعد بھی وہی موقف تھا اور اب 8 مہینے بعد بھی یہی موقف ہے اور 8 سال بھی اس جیل میں رہے تو یہی موقف رہے گا۔

اسکے کچھ دن بعد آج 16 تاریخ کو میری ضمانت سپریم کورٹ سے منظور ہوئی۔۔ جیلیں، تشدد سب کچھ برداشت کرینگے مگر اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹیں گے

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

یاداشت

Scanned with CamScanner

(c) ketabton.com: The Digital Library

Design By: Umar Andish

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library